بند
آنکھوں کا
سفر
مشتاق احمد نوری

بند آنکھوں کا سفر

(افسانوی مجموعہ)

مشتاق احمد نوری

کتاب ـــــــ	بند آنکھوں کا سفر
مصنف ـــــــ	مشتاق احمد نوری
باہتمام ـــــــ	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
بار اوّل ـــــــ	۱۹۹۶ء
تعداد اشاعت ـــــــ	ایک ہزار
ٹائیٹل ـــــــ	محمد مسعود عالم
کتابت ـــــــ	صابر سیوانی و ابوالکلام عزیزی
قیمت ـــــــ	ایک سو روپے
طباعت ـــــــ	اعلیٰ پریس دہلی

BAND AANKHON KA SAFAR

(SHORT STORIES)

BY

MOSHTAQUE AHMED NOORI

37/60, OFFICERS FLAT, BAILEY ROAD, PATNA-800001

1996

RS. 100/=

تمھارے نام

کہ تم نے

میری بکھری زندگی میں

شائستگی

پیدا کر دی ـــــ!
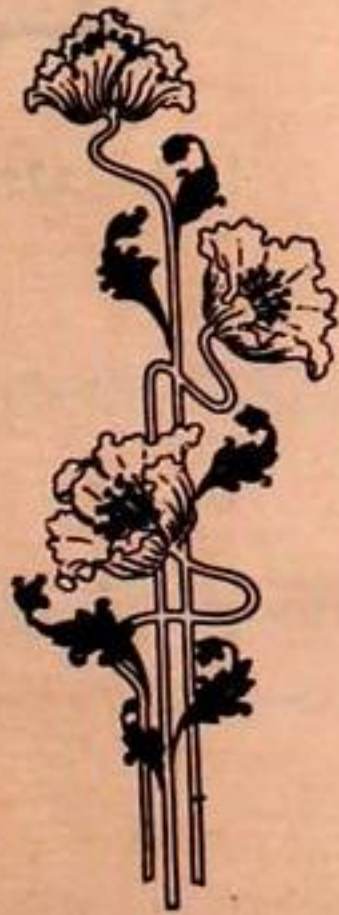
یہ کتاب بہار اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے

ابتدائیہ

کیا آج کا فن

اپاھج ہے

کہ اسے

تبصروں، تقریظوں اور تعریفوں

کے ٹھیلے پر بیٹھا کر

در در

شہرت اور مقبولیت کی

بھیک منگوائی جائے ؟

زندہ

اپنے قدموں پر

چلتا ہے ۔ چلتا ھی رھتا ہے

مُردہ

چار کے کندھوں پر

سوار ھو کر بھی

قبرستان ھی جاتا ہے !

ابتدائیہ

خود کشی

میں مچھروں سے بہت ڈرتا ہوں۔

صرف اس لئے کہ وہ سامنے سے وار کرتے ہیں اور وارننگ بھی دیتے جاتے ہیں کہ بچ سکتے ہو تو بچ لو کہ میں وار کر رہا ہوں۔

میں اشرف المخلوقات ہوں۔ خدا کی سب سے اعلیٰ و افضل مخلوق، جسے اس نے اپنا خلیفہ بنا کر دنیا کی حکومت سونپی تھی۔ میں خدا کا نائب، مچھروں سے بیحد خوفزدہ ہوں کہ وہ چیلنج کر کے وار کر جاتے ہیں، اور میں وار بچانے کے چکر میں خود کو ہی مار بیٹھتا ہوں۔

میں خدا کی اعلیٰ ترین تخلیق ہوں اور اپنی تہذیب کے پیش نظر ہمیشہ گھات لگا کر پیچھے سے وار کرتا ہوں۔ چاہے دوست کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا ہو یا دوسرے ملک کی سرحد پر حملہ کرنا ہو، مظلوموں پر ظلم ڈھانا ہو یا کسی جلتے چراغ کو بجھانا ہو۔ میں ہمیشہ گھات لگا کر وار کرنے کا عادی رہا ہوں۔ یہی طریقہ میرے لئے افضل

ہے اور میری سرشت میں داخل ہے۔ اس عادت کو میں نے اپنے مورث سے حاصل کیا اور اسے وراثت کے طور پر اپنی نسلوں کو سونپوں گا اور انھیں یہ بھی تلقین کر دوں گا کہ —

تم اعلیٰ ترین مخلوق اس زمین پر خدا کے نائب ہو اس لئے انسانیت کی جو تہذیب ہے اسے ہرگز مسخ نہ کرنا اور ہمیشہ گھات لگا کر وار کرنا کہ یہی تمہارے پرکھوں کا وطیرہ رہا ہے۔ اگر کبھی تم نے مچھروں کی طرح اپنے مقابل کو ہوشیار کر کے سینے پر وار کرنے کی غلطی کی تو تمہاری بزدلی کی مثال ہر زمانے میں دی جائے گی اور تمہارا نام خدا کے خلیفہ کی فہرست سے کاٹ کر کیڑے مکوڑوں کے ساتھ مچھروں کی فہرست میں لکھ دیا جائے گا۔"

میں کہ اپنی تہذیب کا امین، مچھروں سے بہت پریشان ہوں۔ نہ میں نے ان سے لڑائی مول لی ہے اور نہ ہی انہیں اکسانے کی غلطی کی ہے، پھر بھی وہ مجھے تنگ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور بار بار وارننگ دے کر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ مجھے اس بات کی فکر نہیں کہ وہ میرے بدن کا خون چوس لیں گے بلکہ فکر اس بات کی ہے کہ وہ جس طرح مجھے مقابلہ کے لئے اکسا رہے ہیں اور سامنے سے وار کر رہے ہیں، وہ میری اپنی تہذیب کے منافی ہے۔ میری تہذیب میرے خون سے زیادہ قیمتی ہے کہ اسے ہی تو اپنی نسل کو ورثے میں سونپنا ہے سو اس کی حفاظت مجھ پر لازم ہے اس لئے ان کم بخت مچھروں سے نجات پانا ضروری ہے۔

میں نے ایک عمدہ قسم کی مچھر دانی حاصل کی ہے۔ یہ مچھر دانی بھی میرے پرکھوں امانت ہے اور یہ میرے لئے ہمیشہ حفاظت کا سبب بنی ہے۔ اس کے چاروں کونوں کو میں نے مضبوط ڈنڈے کی مدد سے باندھ دیا ہے اور خود اس کے اندر ہو گیا ہوں پھر مچھر دانی کے چاروں طرف کے فاضل حصے کو میں بستر کے نیچے دبا

دیتا ہوں تاکہ اسے ایک قلعے کی صورت دے سکوں۔

اب یہ مچھر دانی میرے لئے ایک قلعہ ہوگیا ہے اور میں اس میں محفوظ ہوں۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑاتا ہوں۔ مچھر دانی کے اندر ایک بھی مچھر نہیں ہے۔ محفوظ ہونے کا نشہ مجھ پر چھا جاتا ہے اور میں بستر پر لیٹنے سے قبل مچھر دانی کے باہری حصے پر چپکے ہوئے بے بس مچھروں پر نظر ڈالتا ہوں۔ ان کی حالت قابلِ رحم ہے۔ ان کی اس بے بسی سے میں لطف اندوز ہوتا ہوں اور قہقہے لگا کر ان کا مذاق اڑاتا ہوں۔

وہ سارے مچھر، مچھر دانی کے باہری دیوار سے یوں چپکے ہیں کہ ذرا سی مہلت ملنے پر ہی وہ اندر آجائیں گے مگر میں جب قلعے میں محفوظ ہوں جس کی دیوار بہت مضبوط ہے تو اس انسانی قلعے کے اندر داخل ہو پانا ان کیڑے مکوڑوں کے لئے کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔ بے بسی کے عالم میں انھوں نے بھنبھنانا بھی بند کر دیا ہے۔ میں قہقہے لگا کر انہیں طیش دلانے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہ حرکت تک نہیں کرتے۔ میں خوب لطف اندوز ہوتا ہوں کہ دوسروں کی بے بسی میرے لئے ہمیشہ راحت کا سبب بنی ہے کیونکہ میں نائبِ خدا اس زمین پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔

اپنے محفوظ ہونے کے نشہ سے سرشار میں آہستہ سے نرم و ملائم بستر پر دراز ہو جاتا ہوں اور دھیرے سے اپنی ملائم پلکوں کو آنکھوں پر بکھیر دیتا ہوں۔ خوابوں کی حسین وادی سامنے آجاتی ہے اور میں اس میں بھٹکنے کے لئے خود کو آمادہ کر رہا ہوتا ہوں کہ کانوں میں ہلکی سی سرگوشی ہونے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مجھے اکسا رہا ہو۔

"اٹھ۔ اے غفلت میں پڑے ہوئے اشرف المخلوقات۔ اٹھ اور مجھ جیسے حقیر سے مقابلہ کر کہ میں تجھے غفلت سے بیدار کرنے کے لئے آیا ہوں۔"

میں اس ہلکی سی آواز کو اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہوں کیونکہ سونے سے قبل میں نے اچھی طرح یہ اطمینان کر لیا تھا کہ اس قلعے کے اندر میرے علاوہ کوئی دوسرا وجود نہیں ہے۔ اتنے میں وہ آواز پھر سنائی دیتی ہے اور میرے داہنے رخسار پر چبھن کا احساس ہوتا ہے۔ لاشعوری طور پر میں ایک زور دار طمانچہ اس وجود پر جڑ دیتا ہوں جو اس چبھن کا باعث ہو رہا ہے جونہی میرے رخسار پر میرا اپنا چانٹا پڑتا ہے، میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میری آنکھ کھلتے ہی قلعہ کی باہری دیوار سے چپکے سارے مچھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے ہیں میں غصہ سے آگ بگولہ ہو جاتا ہوں کہ میں جو اشرف ترین مخلوق ہوں اس زمین پر خدا کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ میرے سامنے ان مچھروں کی یہ مجال کہ وہ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ میں ان پر برس پڑتا ہوں۔

"تم حقیر ترین مخلوق ہو کر مجھ پر ہنس رہے ہو میں کہ خدا کا نائب تم سب پر فوقیت رکھتا ہوں۔ تمہاری بساط ہی کیا ہے، میری چٹکی میں تمہاری موت بند ہے۔ تم نے یہ ہمت کیسے کی؟"

میرے اتنا کہنے پر وہ چپ ضرور ہو گئے مگر ایک بوڑھے مچھر نے کہا۔

"تم تو اعلیٰ ترین مخلوق ہو خدا کے خلیفہ ہو پھر تم نیند سے بیدار کیوں ہو گئے؟ اس حقیر وجود کے لئے تم نے خود کو کیوں مارا۔ دیکھو تو تمہارے رخسار پر تمہاری انگلیوں کے کتنے گہرے نشان پڑ گئے ہیں!"

"تم چپ رہو کہ میری کسی حرکت کے بھید سے واقف نہیں ہو سکتے۔ تم کیا جانو کہ میری ہر حرکت میں کیا راز پوشیدہ ہے۔"

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ میرے کان میں پھر بھنبھناہٹ ہوئی اور محسوس ہوا کہ میری لمبی ناک پر کوئی مچھر بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا دھیان پھر قلعہ کے اندر لوٹ آیا اور میری نظر اس مچھر پر مرکوز ہو گئی جو ابھی ابھی قلعہ کے اندر کی دیوار پر جا بیٹھا تھا۔

پورے قلعے کے اندر واحد مچھر۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ ایک حقیر سا

وجود۔ میرے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا تھی اسے تو بس ایک ہی حملہ میں قتل
کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اس نحیف و ناتواں مچھر کی بے وقوفی پر ہنسی آ گئی جو خود ہی
اجل کی آغوش میں آنا چاہتا تھا۔ میں دھیرے دھیرے اپنے دونوں ہاتھوں
کو بڑھائے اس کمزور سے مچھر کی طرف بڑھا جو اتنا چھوٹا تھا کہ آسانی سے
نظر کی گرفت میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنی ہتھیلیوں کا ہالہ بنایا اور اس
مچھر کو ان ہتھیلیوں کے اندر لینے کی غرض سے زور سے دونوں ہتھیلیوں کو ٹکرایا
زور کی آواز ہوئی اور وہ کمزور و ناتواں وجود میری ہتھیلیوں میں پس گیا
۔یہی سوچ کر میں نے اس وجود کے خاتمہ سے ایک لذت کا احساس کیا اور
پھر ہتھیلیوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔

ہتھیلی خالی تھی اور مچھر دوسرے گوشے میں موجود تھا قلعے کی باہری دیوار سے چپکے
مچھر پھر ایک بار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ میں نے ان کے قہقہے کو نظر انداز کر دیا کہ اس اکلوتے
مچھر کے خاتمے کے بعد میں ان پر قہقہہ لگاؤں گا۔ میں پھر اس نحیف و ناتواں مچھر کی طرف بڑھا اور
اس بار اپنی تالی کے درمیان اسے پیس دینے کی کوشش کی۔ میری ہتھیلی آپس میں ٹکرا کر
سرخ ہو گئی اور ایک بار پھر مجھے قہقہے کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ اکلوتا مچھر اس
بار بھی میری گرفت میں آنے سے رہ گیا تھا۔

میں نے تیسری بار پوری مستعدی سے اسے اپنی گرفت میں لینے کی
کوشش کی اور اس حقیر وجود کو اپنی ہتھیلی کے درمیان نیست و نابود کرنے
کی غرض سے دونوں ہتھیلیوں کو زور سے ٹکرایا۔ اس بار تالی کی آواز
سب سے زوردار تھی اور اس سے بھی زوردار وہ قہقہہ تھا جو باہر کے مچھروں
نے لگایا تھا۔

"تم آخر کب تک قہقہہ لگاتے رہو گے۔؟" میں نے جھلاتے ہوئے ان
سے کہا۔

"جب تک کہ تم نائب خدا اس حقیر ترین مخلوق سے ہارتے رہو گے۔"

"تمہارا قہقہہ دراصل تمہاری موت کا پیغام ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہر بار وہ مچھر میرے وار سے بچ جائے گا۔"

"ہاں"۔ ایک بوڑھے مچھر نے میری طرف دیکھتے ہوئے بہت نرم لہجے میں بات جاری رکھی۔

"سنو کہ تم خدا کے نائب ہو، تم اس مچھر کو اس وقت تک نہیں مار سکتے جب تک کہ اس کے اندر تمہارا خون داخل نہ ہو جائے۔

"کیا بات کرتے ہو۔ اس کی یہ مجال کہ میرے جاگتے رہنے پر میرا خون اپنے اندر اتار لے۔"

"ہم کبھی مردار کا خون نہیں چوستے۔ وہ کبھی غفلت میں تم پر وار نہیں کرے گا۔ اب تم ہی نہ جاگنا چاہو تو وہ چوکے گا بھی نہیں۔ اور پھر اگر اسے مارنا ہی ہے تو تمہیں اتنی قربانی تو دینی ہی ہوگی۔ تمہارا ناپاک خون اس کے اندر جاتے ہی اس کی ساری توانائی سلب کر لے گا اور اس کی تیزی وطراری ختم ہو جائے گی۔ پھر تم اسے بہت آسانی سے مار لو گے۔"

"تم بک رہے ہو، بوڑھے کھوسٹ۔" میں چیخ پڑا کہ یہ حقیر مچھر زبان درازی کر رہا تھا اور مجھ پر طعنے کس رہا تھا۔ میں دھاڑا۔

"تم مجھے درس نہ دو۔ اور تمہیں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم جیسے حقیر وجود کو مارنے کے لئے میرے پاس ابھی بہت سے طریقے ہیں۔"

"ہوں گے۔" اس بوڑھے مچھر نے بہت لاپروائی سے بات جاری رکھی۔ "مگر تم بہت کچھ بھول بھی رہے ہو۔ تم نے ہم جیسے کیڑے مکوڑوں کو مارنے کے لئے کیا کیا جتن نہ کئے۔ کیسی کیسی زہریلی گیس ایجاد کی — مگر انجام تمہارے

سامنے ہے ۔ تمہاری ساری کوششیں الٹی ثابت ہوئیں۔ تم تو اپنے ہی جال میں پھنسنے کے عادی رہے ہو ۔۔۔۔"

"چپ ہو جاؤ مردود ۔ میرے صبر کا امتحان نہ لو ۔" میں حلق پھاڑ کر چیخ پڑا۔ جی میں آیا کہ قلعے سے باہر نکل کر اس بڈھے کو وہ سبق سکھاؤں کہ اس کی آئندہ نسلیں تک یاد رکھیں ۔ مگر میں ڈر رہا تھا۔ ڈر اس بات کا نہیں تھا کہ قلعے کے کمزور ہوتے ہی میرا شکار باہر نکل جائے گا بلکہ ڈر اس بات کا تھا کہ باہر کے سارے مچھر ذراسی بھی چوک کا فائدہ اٹھا کر اندر گھس آئیں گے۔

میں کہ نائب خدا قلعے کے اندر محفوظ تھا اس لئے میں نے اندر سے ہی دہاڑتے ہوئے کہا۔

"تم پاکھنڈی مجھے اپنی باتوں سے مرعوب نہیں کر سکتے کہ دنیا کی بڑی بڑی کتابیں بھی اپنا رعب مجھ پر ڈالنے میں ناکام رہی ہیں۔ میں اشرف ترین فاتح ہوں اس زمین کا جس کی تم ادنیٰ ترین مخلوق ہو۔ شرم کرو اور اپنی زبان درازی سے باز آجاؤ۔"

میری باتوں سے بڈھا نرم ہونے کے بجائے اور بھی گرم ہو گیا۔

"میں زبان درازی نہیں کر رہا ہوں مجھے تمہارے اشرف ہونے اور اپنے احقر ہونے میں ذرہ برابر بھی شک نہیں ۔ میں اسے ہزار بار تسلیم کرتا ہوں ، مگر تم مجھے ایک بار بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو ۔ تم شاید یہ بھی بھول گئے ہو کہ میرے ہی ایک لنگڑے ساتھی نے تم جیسی ایک اشرف مخلوق کے سر پر جوتے لگوائے تھے اور اس کے خاتمے کا سبب بنا تھا۔"

بڈھا کچھ زیادہ ہی چالاک لگ رہا تھا ۔ اس سے بحث کرنا بے کار تھا۔ اب مجھ جیسے افضل کے لئے یہ مناسب بھی تو نہیں کہ میں ہر کسی کے منہ لگتا پھروں ۔ پوری بحث ایک ناتواں و کمزور مچھر سے شروع ہوئی تھی بس اسے

مار دینا تھا۔ معاملہ ختم۔

اس لئے میں نے اپنی ساری توجہ قلعے کے اندر مرکوز کر دی اور اس مچھر کو تلاش کیا جو اتنا چھوٹا تھا کہ قلعے کی دیوار ہی کا حصّہ لگ رہا تھا۔

میں اس کی طرف اپنی ان ساری چالاکیوں اور فریب کاریوں کے ساتھ بڑھا جو مجھے ورثہ میں ملی تھیں۔ اس بار میں نے اس بے وقعت وجود کو ختم کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اور پھر تالی کی زوردار آواز ابھری اور مجھے محسوس ہوا کہ اس بار معاملہ صاف ہو گیا۔ میں نے اپنی ہتھیلیوں کو جلدی سے دیکھا جو اس بار بھی صاف تھیں اور اندر کا لہو باہر ہی سے چھلک رہا تھا۔ ہتھیلیاں تمتمانے لگی تھیں۔ مچھر اس بار بھی صاف بچ نکلا تھا۔ اب تک میں نے جتنے بھی وار کئے تھے سب مجھ پر ہی پڑے تھے اور ساری تکلیف میں نے ہی محسوس کی تھی۔

قلعے کی باہری دیوار سے چپکے قہقہوں نے مجھے پاگل کر دیا اور میں نے اس پر تابڑ توڑ حملہ کرنا شروع کر دیا۔ قلعے کی چھت نیچی تھی اس لئے میں اپنے ہاتھ پاؤں پر کھڑے ہونے کی بجائے اپنے گھٹنوں کے بل ہی چل رہا تھا۔ کبھی کبھی تو گھٹنوں کے ساتھ اپنے ہاتھوں کا بھی سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ میرے ہر وار نے باہر کے قہقہے میں اضافہ کیا اور مچھر میری گرفت سے محفوظ رہا۔

میرے قلعے کے اندر میرا دشمن میرے وار سے محفوظ تھا اور میں ہی خود کو اب غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا کہ اس کمزور و ناتواں مچھر کا وجود میرے لئے خسارے کا سبب ہو سکتا تھا۔

تھوڑی دیر تک میں نے اپنے پرکھوں کو یاد کیا اور اپنے افضل ہونے کے احساس کو تازہ کیا۔ پھر پوری شدت سے اس غافل مچھر پر قہر بن کر ٹوٹ پڑا۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ ہر وار خالی رہا اور وہ ہر بار خود کو بچانے میں کامیاب رہا۔ میری ہتھیلی اب مزید وار جھیلنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اتنے

میں اس بوڑھے مچھر نے پھر کہا۔

"تم خواہ مخواہ خود کو مصیبت میں ڈال رہے ہو۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اگر اسے مارنا ہی ہے تو اس کے اندر اپنا غلیظ خون داخل ہونے دو۔ جو اس کی ساری تیزی و توانائی چھین کر اسے کاہل بنا دے گا اور تم ایک ہی وار میں۔۔۔"

تم چپ رہو۔ مجھے کیا کرنا ہے یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ابھی میں نے اپنے سارے۔۔۔۔"

"تم کہ نائب خدا اس زمین کے آقا ہو اور میں تمہارا محکوم ۔۔ میرا کام ہی ہے تمہیں صحیح راہ دکھانا، چاہے اس میں میرا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ اس لئے یاد رکھو تم اس وقت تک اسے نہیں۔۔۔۔"

"خاموش گستاخ۔" میں نے چیخنے میں اپنی ساری توانائی صرف کر دی۔ میرے حلق میں خراش آ گئی اور میں ہانپنے لگا۔

رات آہستہ آہستہ اس گھاٹ کی جانب بڑھ رہی تھی جہاں اس کی زندگی کو ختم کرنے والا سورج چھپا بیٹھا تھا۔ میں بھی اب اس بھاگ دوڑ سے تنگ آ گیا تھا۔ اچانک ایک خیال ذہن میں آیا۔ یہ تنہا مچھر باہر تو جا نہیں سکتا کہ اگر اسے باہر جانا ہی ہوتا تو وہ اندر آتا ہی کیوں۔ اور پھر قلعے کی دیوار بہت مضبوط تھی وہ چاہنے پر بھی باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اسے تو کبھی بھی مارا جا سکتا تھا، اور آخر یہ میرے بدن کا کتنا خون کم کرے گا۔ اس کی بساط ہی ایک قطرے کی ہے۔ سمندر سے اگر ایک قطرہ نکل بھی جائے تو کیا فرق پڑے گا۔ اور صبح کو جب میں بیدار ہوں گا تو پوری طرح چاق و چوبند رہوں گا اور آسانی سے اس وجود کو ختم کر دوں گا۔

یہی سوچ کر میں نے اس کمزور مچھر کو حقارت سے دیکھا اور باہری دیوار سے چپکے مچھروں کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے تکیے پر سر

رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ غنودگی کے عالم میں پھر محسوس ہوا کہ کوئی میرے کانوں میں چیخ رہا ہے۔ میں نے اس چیخ کو نظر انداز کر دیا۔ رخسار میں چبھن کا بھی احساس ہوا، مگر میں نیند کی وادی میں رینگ گیا کہ سمندر کے سامنے ایک قطرے کی بساط ہی کیا۔

ابھی صبح نے مکمل طور پر انگڑائی بھی نہ لی تھی کہ میری آنکھیں کھل گئیں۔ خوب جم کر سو لینے کا احساس ہوا۔ ایک خیال آتے ہی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے جلدی سے قلعے کی اندرونی دیوار پر نظریں دوڑائیں مگر وہ نحیف و ناتواں وجود کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کی جگہ ایک گوشہ میں ایک مکھی جیسا وجود ضرور تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اور تب احساس ہوا کہ دراصل یہ وہی مچھر تھا جس نے رات مجھے بہت پریشان کیا تھا اور جس پر کیا گیا سارا وار میں نے اپنی جان پر جھیلا تھا۔

اب وہ کمزور نہیں تھا۔ اس نے اپنی ناتوانی میں مجھے اتنے چکر دیئے تھے، پر اب وہ توانا تھا، کیا میں اسے آسانی سے مار سکوں گا؟ ایک کانٹا میرے ذہن میں چبھا۔ میں نے قلعے کی باہری دیوار کا جائزہ لیا۔ سارے مچھر اب بھی اسی طرح سے چپکے ہوئے تھے اس بار میری تحقیر آمیز ہنسی کا انہوں نے جواب نہیں دیا کہ وہ اپنے ساتھی کے انجام سے واقف تھے۔

اس توانا مچھر کو مارنے سے قبل اس کی تیزی و طراری کا اندازہ لگانا ضروری تھا تا کہ میں اس پر گھات لگا کر وار کر سکوں۔ میں نے آہستہ سے اسے اپنی انگلی سے ٹھوکر ماری وہ دو چار بالشت کی دوری پر دھپ سے جا بیٹھا۔ جبکہ رات وہ اس گوشہ سے اس گوشہ تک کئی چکر مار لیتا تھا۔ اس کی اس کاہلی سے مجھے اپنے اندر ایک توانائی کا احساس ہوا۔ میں بلّی

کی طرح چوہے سے کھیلنے لگا۔ جب شکار سامنے ہو اور گرفت سے نکل بھاگنے کی ساری راہیں مسدود ہو چکی ہوں تو ایک عجیب سی فتح مندی کا نشہ چھا جاتا ہے۔ میں بھی اسی نشہ سے سرشار تھا اور اس مچھر کو بار بار اپنی انگلی سے چھیڑ کر باہر کی طرف تضحیک سے دیکھتا جا رہا تھا مگر وہ سارے مچھر دم سادھے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔

میں اسی طرح کافی دیر تک چوہے بلی کا کھیل کھیلتا رہا اور جب جی بھر گیا تو میں نے بہت ہی آسانی سے اس حقیر سے مچھر کو اپنی ہتھیلیوں کے درمیان دھیرے سے دبا دیا۔

ہتھیلیوں میں ایک نمی اور چپچپاہٹ کا احساس ہوتے ہی مجھ پر اپنی کامرانی کا نشہ چھا گیا۔ میں نے زوردار قہقہہ لگایا اور مسکراتے ہوئے باہر کے مچھروں کی جانب دیکھا۔ جن کا ساتھی قتل ہو چکا تھا۔ میرے قہقہے کے جواب میں قلعے کی باہری دیوار سے چپکے مچھروں نے بہت ہی زوردار قہقہہ بلند کیا۔ اس خلاف توقع قہقہہ سے میں دنگ رہ گیا اور جھلاتے ہوئے بولا۔

"بد بختو! یہ راتوں رات تم میں انسانیت کہاں سے آگئی کہ اپنے ہی ساتھی کے قتل پر یوں قہقہہ لگا رہے ہو۔ رات تو تم مجھے درس دے رہے تھے اور اب اپنی ہار پر یوں ہنس رہے ہو گویا تم نے قلعہ فتح کر لیا ہے۔

"قہہ... قہہ... قہہ... تم کس ہار کی بات کر رہے ہو اور کس کے قتل کی داستان سنا رہے ہو؟"

"کس کے قتل؟ ارے حقیر تو جان بوجھ کر انجان کیوں بنتا ہے۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ تیرا ایک ساتھی میری ہتھیلیوں کے درمیان قتل ہو چکا ہے۔"

قتل ــ؟ کس کا قتل ــ؟ خون ــ؟ کس کا خون کر دیا تم نے؟" اس

بوڑھے مچھیرے نے بہت ہی حقارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے کہ تو نائب خدا ہے۔ ذرا اپنی ہتھیلیوں کو تو دیکھ۔ پھر میرے قہقہے کا راز تجھ پر منکشف ہو جائے گا۔"

پھر وہ سب کے سب یوں قہقہہ لگانے لگے گویا پاگل ہو گئے ہوں۔ ان کے پاگل قہقہے نے مجھے پریشان کر دیا۔ اور میں نے جلدی سے اپنی ہتھیلیوں کی طرف دیکھا اور ساکت رہ گیا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"میں نائب خدا جو اس زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا گیا تھا، میرے ہاتھ میرے اپنے ہی خون سے رنگے پڑے تھے۔

●●

سچ

گرمی اپنے شباب پر تھی اور گاؤں کی بجلی پر بھروسہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ریت کی دیوار پر کب آئی کب گئی، اس کا پتہ ہی نہیں چل پاتا۔

ایسی حالت میں جب بھی گاؤں جاتا ہوں، مسجد ہی کا سہارا لیتا ہوں۔ مسجد میرے دروازے کے بغل میں ہی ہے۔ سامنے کافی کھلی جگہ ہے۔ پورب سے بڑے مزے کی ہوا چلتی ہے۔ مسجد کے موزیک شدہ ورانڈے پر جو خنکی کا احساس ہوتا ہے وہ رگوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ میں اپنا زیادہ تر خالی وقت وہیں گزارتا ہوں لیکن عصر کے بعد جب تعلیم کے نام پر پانچ منٹ رکنے کا اعلان ہوتا ہے تو نہ جانے ڈھیر سارے کام اچانک کیوں یاد آجاتے ہیں اور میں چپکے سے نکل بھاگتا ہوں۔

بقرعید کا دن تھا۔ میں ظہر کے بعد ہوا خوری کے لئے مسجد کے ورانڈے میں لیٹا ہوا تھا کہ مسجد کے موذن فکو (فقیر محمد) تیز تیز قدموں سے آتے دکھائی

دیئے اور تیز سانسوں کے درمیان گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔

"بابو جانتے ہیں! آج دو بجیا ٹرین سے عید گاہ کے نزدیک ایک آدمی گر گیا ہے۔ اس کا سر پتھر پر پڑنے سے پھٹ گیا ہے جس سے بہت سارا خون رس رہا ہے۔"

میں یہ سنتے ہی اچانک ہڑبڑا گیا۔

"یہ کیسے ہوا؟"

"لگتا ہے کسی نے اسے ٹرین سے دھکا دے دیا۔ وہ سر کے بل گرا ہے۔ درد سے چھٹپٹا رہا ہے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔"

"وہ ٹرین سے گرا ہے تب تو یہ ریل کا کیس ہو گیا ریل پولیس کو خبر کرنا چاہئے۔"

مدین بابو نے اپنی رائے دی وہ اکثر قانون کے مطابق رائے دینے میں ماہر مانے جاتے تھے۔

"ہاں! ریل کیس تو ہے لیکن اسے فرسٹ ایڈ کے طور پر کچھ تو دیا ہی جانا چاہیئے۔" میں نے کہا۔

"پولیس آنے سے قبل کچھ بھی کرنا غیر قانونی ہے۔ اگر بعد میں کچھ ہو ہوا گیا تو پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

ان کی بات میں بھی دم تھا۔ میں نے فکو سے پوچھا

"وہاں کوئی ہے کہ نہیں؟"

"بابو دھوپ کتنی تیز ہے۔ ایسی حالت میں وہاں کون کھڑا رہے گا۔ وہ تڑپ رہا تھا دو چار چپراسی وہاں کھڑے تھے۔"

"باقی لوگ؟"

"باقی جو بھی آتا افسوس کا اظہار کرتا اور کھسک جاتا۔ ہر کوئی پولیس کیس سے ڈرتا ہے۔"

لیکن وہ آدمی تڑپ رہا ہے، اس کے لئے کچھ کیا جانا چاہئے یہ کہہ کر میں جانے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ چچا نے کہا۔

"یہ میری چھتری لیتے جانا دھوپ بہت تیز ہے"

میں ان کی طرف دیکھا ہی تھا کہ مدین بابو نے بتایا۔

"آپ ایک بڑے عہدے کے سرکاری افسر ہیں۔ آپ جائیں گے تو بات پولیس تک بھی پہونچے گی کون جانے گرنے والا ہندو ہے یا مسلمان۔ اگر ہندو ہوا اور خدانخواستہ مر گیا تو پھر آپ کو بھی پولیس گواہی میں آنا پڑے گا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے، تم جاؤ گے تو ذمہ داری تو لینی ہی پڑے گی پھر پولیس کو بھی خبر کرنا ہوگا اس کے ساتھ رہنا بھی ہوگا۔ پھر اسپتال کا چکر اور اگر کچھ ہو گیا تو تم کہاں کہاں دوڑتے پھروگے"

میرے اندر کا انسان اچانک آدمی بن گیا اور لمحہ بھر میں اتنی سوجھ بوجھ آگئی کہ ساری اونچ نیچ نگاہوں میں پھر گئی اور اس تڑپتے ہوئے آدمی کی جگہ صرف پولیس وردی میں ایک کڑک آدمی دکھائی دینے لگا پولیس جس کا ڈر کس دل میں نہیں ہے آدمی کتنا ہی خونخوار ہو، چاہے ہزاروں کا قتل کرے لاکھ جابر ہو، خدا سے چاہے نہ ڈرے۔ لیکن پولیس سے ضرور ڈرتا ہے۔

میں بھی پولیس سے ڈر گیا واقعی سارا منظر نگاہوں میں پھر گیا میں جائے واردات پر جاؤں گا۔ گاؤں بھر کے لوگ مجھے جانتے ہیں۔ میرے جانے سے ساری ذمہ داری مجھ پر ہی آجائے گی پھر سب مجھے ہی کرنا پڑے گا، وہ مر گیا اگر ہندو نکلا تو اور بھی جھمیلہ ہوگا۔" بقرعید کے موقع پر ایک مسلم گاؤں میں ایک ہندو کا دن دہاڑے قتل" کون جانے، فساد ہی ہو جائے اور وہ سب ہوگا جو ہوتا آیا ہے۔

میں مسجد کے ہی ورانڈے پر بیٹھ گیا۔ لیکن بے چینی و بیقراری برقرار تھی۔

چھوٹے بھائی کو بلایا اور تازہ صورت حال جاننے کے لئے کہا۔
آدھے گھنٹے کے بعد اس نے آکر بتایا کہ بھیڑ کافی بڑھ گئی ہے زخمی مسافر بہت تڑپ رہا ہے لوگوں نے اس کی گمچھی سے اس کا سر باندھ دیا ہے ایک چرواہے نے پانی لاکر پلایا جسے وہ مشکل ہی سے پی سکا وہ اتنے شدید کرب میں مبتلا ہے کہ اپنا نام بھی نہیں بتا سکتا۔ اس کے ساتھ صرف ایک تھیلا ہے جس میں اس کے کپڑے ہیں۔
"شکل سے کیا لگتا ہے"
میں نے جلدی سے پوچھا۔ میری بات سمجھتے ہوئے بھائی نے بتایا۔
"شکل سے ہندو لگتا ہے نہ مسلمان۔ صرف آدمی لگتا ہے"
میری پریشانی کچھ اور بڑھی۔ اگر مسلمان ہوتا تو پریشانی کم ہو جاتی کہ کچھ ہو جانے پر کم از کم فساد کا ڈر نہیں رہتا۔
لیکن اگر ہندو نکلا۔ اور مر گیا تو؟
اس ادھیڑ بن میں تھا کہ موذّن نے عصر کی اذان دینی شروع کر دی اور مجھے اذان کے الفاظ بھی دہرانا یاد نہیں رہا۔ بس وہ زخمی ہی یاد رہا۔
نماز بعد میں نے مکھیا جی سے کہا۔
"مکھیا جی! ٹرین سے کوئی مسافر گر کر زخمی ہو گیا ہے ریلوے کو اس حادثہ سے انفارم کر دیتے تاکہ پولیس آکر کارروائی شروع کر دیتی"
"وھت چھوڑیئے نا آپ — یہ سب بکھیڑا ہیں آپ کاہے کو پڑتے ہیں۔ سرکاری افسر ہیں کچھ ہو گیا تو آپ پریشانی میں پڑ جایئے گا۔ شام تک سب ٹھیک ہو جائے گا"
"اگر وہ مر گیا تو؟"
"نہیں نا مرے گا۔ ایسا کیس ہوتے رہتا ہے"
انہوں نے اتنے اطمینان سے کہا گویا یہ کوئی بڑا مسئلہ نہ ہو۔

نماز بعد میں نے ہمت کی۔ اب جو بھی ہو ایک آدمی کو یوں ہی مرنے کے لئے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں سرکاری افسر ہوں تو ذمہ داری بھی تو ہے، میں اپنا بچاؤ تو کر ہی سکتا ہوں میری بات کا ایک وزن تو ہو گا ہی۔ یہی سوچ کر میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"میں ایک چکر لگا آتا ہوں پولیس میرا کیا بگاڑے گی"

"پولیس ـــ" ایک لمبی سانس لے کر مدین بابو بولنے لگے۔

"گجرات کے چیف جوڈیشیل مجسٹریٹ کا قصہ ابھی پرانا نہیں ہوا۔ آپ نے بھی پڑھا ہو گا۔ کس طرح پولیس نے انہیں مارا پیٹا، ہتھکڑی لگائی اور لاک اپ میں بند کر دیا۔ شراب کے نشے میں دھت ہونے کا الزام لگایا۔ اور بے چارہ مجسٹریٹ ایک مجرم کی طرح سب سہتا رہا۔"

میں چونک گیا سارا کیس سامنے آ گیا۔ میں مدین بابو کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے بات جاری رکھی۔

"جو مجسٹریٹ مجرموں کو سزا دیتا ہے جس کے قلم کے اشاروں پر مجرموں کے فیصلے کا دارو مدار ہوتا ہے وہی پولیس سے نہیں بچ سکا۔ آپ تو ٹھہرے ایک مسلمان آفیسر اور آفت آئے گی۔"

میں ایک بار پھر چونک پڑا۔ دسمبر کے بعد سے تو پورے ملک کی سوچ میں اچانک تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا۔ ہر کوئی دوسرے سے خوفزدہ لگنے لگا تھا۔ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا میرا عزیز دوست شکلا بھی کبھی کبھار مجھے چھیڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔ وہ صرف "کیوں میاں جی کیا حال ہے" کہتا لیکن ایک جملے میں کیا کچھ چھپا ہوتا تھا اسے یا تو وہ جانتا تھا یا پھر میں سمجھتا تھا۔ بلکہ میں تو کچھ زیادہ ہی سمجھتا تھا۔

میری انسانیت کے غبارے سے پھر ہوا نکل گئی۔ میں نے اس زخمی مسافر کے بارے میں سوچنے کا ارادہ ہی بدل دیا۔ اور چپ چاپ گھر آکر ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن ہر صفحے پر زخمی مسافر کی تصویر ابھرنے لگی۔

پھر اچانک سوچ نے ایک اور کروٹ بدلی اگر وہ زخمی مسافر مرگیا تو پولیس پوری تحقیق کرے گی اور تحقیق کے درمیان یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ ایک سرکاری افسر بھی حادثے کے وقت گاؤں میں موجود تھا اور اس نے اس سلسلے میں کوئی بھی کارگر قدم نہیں اٹھایا۔ وہ سرکاری افسر تھا اس لئے سرکاری طور طریقوں سے اسے واقفیت تھی اس کی کوتاہی اور لاپرواہی سے زخمی نے دم توڑا ہے اس لئے اس کے مرنے میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ اگر خدانخواستہ مرنے والا مسلمان نہ ہوا تو۔۔؟

میں چاروں طرف سے گھر گیا اب کر بھی کیا سکتا تھا۔ رات تو کسی طرح بسر کرنی ہے کل سویرے ہی اررِیا چلا جاؤں گا وہاں بس کا ریزرویشن کرواکر شام پٹنہ کے لئے روانہ۔۔ بس نجات کی یہی صورت دکھائی دینے لگی۔

رات کسی طرح گزر گئی صبح سویرے تیار ہو ہی رہا تھا کہ رضی اور انجم اررِیا سے آگئے۔

"بھیّا آپ گھر آکر چپکے سے کیوں نکل جاتے ہیں اس بار سرکار نے آپ کو ایک اہم ذمہ داری سے نوازا ہے۔ اردو کی بھلائی کے ساتھ اپنے چھوٹے بھائیوں کو بھی یاد رکھیئے"

میں نے ان لوگوں سے وعدہ کر لیا کہ سب کچھ ہو گا۔ خوب دھیان دوں گا وغیرہ پھر ان لوگوں نے اررِیا چلنے کی دعوت دی اندھا کو چاہیئے دو آنکھیں۔ میں تیار تھا ہی،

گھر سے ادر یا بھاگ آیا۔

یہاں دوستوں کی محفل میں طبیعت کچھ بہل گئی۔ شام میں لوگوں نے "ہم سب" کی طرف سے ایک اعزازی نشست کا انتظام کیا اس میں کئی ایک مقررین نے میری ادبی خدمات، میری انسانیت میری ہمدردی، میری غربا پروری، میری صلاحیت وغیرہ کے خوب خوب چرچے کئے اور میری ان صلاحیتوں کا بھی ذکر کیا جن سے میں بھی پہلی بار واقف ہوا تھا اور خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا جلسے کے آخر میں صدر مجلس سے گزارش کی گئی کہ وہ میری خدمات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔

صدر مجلس اپنی جوشیلی تقریر کے لئے خاصے مشہور تھے۔ انہوں نے کنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے فرمایا۔

یہ شخص جسے آج آپ نے اعزاز سے نوازا ہے اسے میں ایک عرصے سے جانتا ہوں۔ یہ شخص آسمان سے بڑا ہو کر نہیں ٹپکا بلکہ اس نے غریبی کی دھند میں ہی آنکھ کھولی، بچپن سے جوانی تک نہ جانے کتنی بار اس نے دکھوں کی آنچ محسوس کی ہو گی اور اس آنچ ہی میں تپ کر یہ شخص کندن بنا ہے۔

"آپ نے ان کی ادبی خدمات کو سراہا۔ اچھا کیا۔ ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے میں ان کی انسان دوستی اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے ان کے لگاؤ کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔"

یہ شخص بے حد کومل دل رکھتا ہے اتنے نازک احساس کا مالک ہے کہ کسی کو تڑپتا نہیں دیکھ سکتا۔ یہ اپنی جان پر، اپنی آن پر، کھیل کر تڑپتی انسانیت کی لاج رکھتا ہے کسی کو مرتا ہوا دیکھنا تو دور کی بات ہے۔ یہ کسی کو روتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتا۔

"انسانیت کی جس بلندی پر یہ شخص براجمان ہے۔
وہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"یہ سب بکواس ہے ــــ سب جھوٹ ہے یہ"

میں چونک پڑا۔ یہ آواز کس کی تھی؟ کہاں سے آئی؟ مقرر کی آواز بھی اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔

••

۲

ایک مٹھی تم

میں ابھی ابھی وہاں سے لوٹا ہوں اور کمرے میں بیٹھا سامنے کی دیوار پر نظریں گڑائے اس کی دوسری جانب دیکھ رہا ہوں۔ دور۔ بہت دور۔ ذہن میں اس کی کہی گئی باتیں ہی گونج رہی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں — نہیں میں سوچ کب رہا ہوں۔ ذہن میں سوچنے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ تو خالی ہے۔ نہیں نہیں وہ خالی کب ہے۔ وہاں تو ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا ہے۔

"ہاتھ دھونا پڑتا — ہاتھ دھونا پڑتا — ہاتھ ....."

ایک ہی جملہ پورے ذہن میں چکر کاٹ رہا ہے۔ پھر اس کے سارے حروف مٹ گئے ہیں ذہن میں گھل گئے ہیں۔ صرف ہاتھ رہ گیا۔ بس ہاتھ!

اس کا نازک ہاتھ میرے ہاتھوں پر رکھا ہے۔ انگلیاں میری انگلیوں میں الجھی ہیں اور نگاہیں کہیں دور آسمان کی وسعت میں ٹکی ہوئی ہیں جہاں ایک تنہا پرندہ ہوا کے دوش پر اڑتا جا رہا ہے۔ خاموشی کے ساتھ. اپنے پروں کو پھیلائے۔ ساکت۔ اسے کچھ بھی فکر نہیں کہ آگے کیا ہے۔ دائیں بائیں کیا ہے اور پیچھے ــــ نہیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی نہ تو اسے فرصت ہے اور نہ ہی ضرورت ــــ

ہر معاملہ میں پیچھے مڑ کر دیکھا بھی تو نہیں جا سکتا۔ کچھ معاملے نتیجے سے بے نیاز ہوتے ہیں.

اچانک میں نے اپنے ہاتھوں پر ایک سرد سی لمس محسوس کی ہے اور چونک پڑا ہوں۔

"اس کا لمس اتنا سرد کیسے ہو گیا؟"

میں دیواروں کے درمیان لوٹ آیا ہوں۔ سامنے خسرو کھڑا ہے، میرا تین سال کا بیٹا۔ میرے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھے میری انگلیوں سے کھیلتا ہوا ــــ میں جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔

"یہ تم نے کیا کیا بیٹے ــ؟"

خسرو حیران کھڑا ہے اس کی سمجھ میں میری باتیں نہیں آ رہی ہیں. وہ کچھ کہہ رہا ہے مگر میں سن نہیں رہا ہوں۔ میں تو ان دیکھے اور انجانے حصار میں گھرا سوچ رہا ہوں.

"اجی ــ سنتے ہیں کچھ ــ؟ گھر میں ہیں تو گھر میں ہی رہیئے۔ آپ ہمیشہ گھر میں رہتے ہوئے بھی باہر کی سیر کیوں کرنے لگتے ہیں؟"

یہ میری بیگم کی آواز ہے۔ شریک حیات کی۔ مگر اس میں مٹھاس کیوں نہیں ہے؟ میں اس کی جانب دیکھتا ہوں۔ اس کی نگاہیں میری

پیشانی پر ٹکی ہوئی ہیں اور اتنی تیز ہیں گویا دماغ کے اندر داخل ہو کر سارا راز جان لینا چاہتی ہوں۔

"ہوں — تم نے کچھ کہا — ؟"

"میں نے کچھ نہیں — بہت کچھ کہا ہے۔ مگر کوئی سنے بھی تو — ؟"

"سن تو رہا ہوں۔"

"کب سے کہہ رہی ہوں تیس روپے دیجئے۔ ننھی کے لئے دودھ منگوانا ہے۔"

"تیس روپے — ؟"

"ہاں تیس روپے۔ دو دن ہو گئے دودھ ختم ہوئے۔ گوالا جو سفید پانی دیا کرتا ہے وہ تو میں ننھی کو پلانے سے رہی۔"

"فی الحال تو میری جیب خالی ہے۔ تمہارے پاس رقم موجود ہے منگوالو۔"

"میں اپنی رقم سے دودھ نہیں منگوا سکتی۔ اس کی ذمہ داری آپ پر ہے۔"

"ذمہ داری — ؟ بچی صرف میری نہیں تمہاری بھی ہے بیگم —"

"میں نے پیدا کرنے کی فرمائش نہیں کی تھی، سمجھا۔ مجھ سے ان فضول باتوں کی توقع نہ کیا کریں۔ دودھ منگوانا ہو تو منگوائیے ورنہ یہ رہی بچی، سنبھالئے، میں ہاسٹل چلی جاؤں گی۔"

میں دنگ رہ گیا ہوں۔ یہ ایک ماں کی آواز ہے جس کی بچی صرف چھ ماہ کی ہے، یہ میری شریک حیات کی آواز ہے — ایک ہم سفر، ہم نوا —

"میاں بیوی ایک دوسرے کے لباس ہیں۔"

"میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔"

اف — کس نے کہی تھی یہ بات — ؟ میں اپنے کان بند کر لیتا ہوں مگر آنکھیں کھلی ہیں اور ریل کی دو پٹریاں نظر آ رہی ہیں۔ زندگی بھر ساتھ چلنے والی

پٹریاں — کبھی مل نہیں سکتیں۔ جب بھی ملنے کی کوشش کریں گی، ایک حادثہ ہو جائے گا، سنگین حادثہ۔

میں بیگم کے بڑبڑانے کی آواز سن رہا ہوں۔ یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اب تو اس کا عادی ہو گیا ہوں میں۔ وہ ہاسٹل جانے کی دھمکی دیتی ہے۔ چلی جائے — لیکن میں کہاں جاؤں — ؟ سوچتا ہوں، اکثر سوچتا ہوں کیونکہ اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتا۔

ایک دن میں نے نلنی سے کہا بھی تھا۔

جانتی ہو تم — میں اپنی ازدواجی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ بیوی کی شکل میں ایک مستقل عذاب میرے سر پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ اور — اور —"

"یہ کس کی بات کر رہے ہیں آپ — ؟" نلنی نے میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"اپنی بیوی کی — ؟ پھر وہ خاموش ہو گئی لیکن اس کی آنکھیں ابل پڑیں، کہنے لگی۔

"آپ کی بیوی جیسی بھی ہے میرے لئے عظیم ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ آپ کی ذات سے جڑی ہوئی ہے۔ اور آپ کی ذات سے وابستہ ہر کوئی میرے لئے قابلِ احترام ہے۔ اس لئے آپ مجھ سے ان کی شکایت نہ کریں۔ میں شاید برداشت نہیں کر پاؤں گی۔"

نلنی کا ایسا خیال ہے۔ میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ میری بیوی کی شکایت صرف اس لئے نہیں سن سکتی کہ وہ میری ہے۔ اور میں جس کا ہوں اسے میرا خیال کب ہے — ؟

یہ نلنی بھی عجیب لڑکی ہے۔ آخر یہ کون ہے میری؟ میں اکثر سوچتا ہوں۔ ساجد اور نلنیؔ کا رشتہ کیسا ہے؟" یہ عجیب سا رشتہ کب اور کیسے ہمارے درمیان آگیا۔؟ کسی کو پتہ ہی نہیں چلا۔ دونوں کو احساس اس وقت ہوا جب سوچنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

نلنی سے ملنے کے بعد میں خالی خالی سا کیوں ہو جاتا ہوں۔ وہ مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتی ہے، سارے جہان کی باتیں، میرے ارد گرد کی باتیں۔ پھر بھی جب میں لوٹتا ہوں خالی خالی سا لگتا ہوں۔

نلنیؔ اتنا کچھ دے کر سب کچھ کیسے لے لیتی ہے؟"

کبھی کبھی میں سوچنے لگتا ہوں۔

میں شہر کا ایک ذمہ دار شخص ہوں۔ ایک شوہر جس کی بیوی ایم اے ہے۔ میں لکچرر ہوں تو بیوی اسکول میں ٹیچر ہے۔ دو بچوں کا باپ۔ دنیا کے ڈھیر سارے جھمیلے۔ ذمہ داریوں کی سل اٹھائے۔۔۔

مجھے کب اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ اتنی باتیں سوچ لیتا ہوں؟"

نلنی بھی خوب ہے۔ اتنے چپکے سے میری زندگی میں داخل ہوئی کہ میں محسوس بھی نہ کر سکا۔ احساس تو تب ہوا جب وہ آ چکی تھی۔ سیدھی سادی سی لڑکی۔ سانولا سا رنگ کوتاہ قد۔ معمولی سا ناک نقشہ۔ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ شاید ہے۔ اس کی آنکھیں۔ ہاں آنکھیں ہی تو ہیں۔ جب وہ میری جانب دیکھتی ہے تو میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ دائیں، بائیں اور پیچھے کی ساری باتیں۔ صرف سامنے نظر آتا ہے۔ اڑتے ہوئے پنچھی کی طرح۔

یہ کیسی عجیب محبت ہے؟

کیسا پیار ہے یہ ؟

اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ نلنی کے گھر والے زبردست ڈھنگ سے اس کی سرزنش کر چکے ہیں۔

ساجد سے تمہارا کیا رشتہ ہے ؟

تم پاگل تو نہیں ہو گئیں — ؟ سماج تمہیں زندہ بھی رہنے دے گا ؟

تمہاری یہ پاگل محبت کتنوں کو پاگل کر دے گی — اور گلی کوچے میں پاگل کتے بھونکتے پھریں گے۔

سڑک اور چوراہے لاشوں سے بھر جائیں گے۔

گلیاں ویران ہو جائیں گی۔

سرخ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگیں گے۔ اور ہوائیں سسکیوں اور آہوں سے گونج اٹھیں گی —

مگر وہ یہ سب کب سوچتی ہے۔

یہاں بھی ریل کی دو پٹریاں ہیں۔ ساتھ چلنے والی پٹریاں، جن کے ملن سے حادثہ ہو سکتا ہے۔ عظیم حادثہ۔

ایک بار میں نے خود بھی کہا تھا —

"نلنی — میں سوچتا ہوں۔ ہاں اکثر سوچتا ہوں کہ زندگی کے نازک پل کو آخر ان کھونٹوں سے کیوں باندھیں جو خود ریت میں گڑے ہوں۔"

"آپ بھی سوچتے ہیں ؟ ضرور سوچیے۔ میں کیوں سوچوں ؟"

کیا ہوگا — کب ہوگا — کیوں اور کیسے ہوگا — اتنے سارے سوالات ایک ساتھ —

"نا بابا نا — میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ کتنی عجیب ہے یہ لڑکی — نہیں عجیب یہ نہیں — عجیب تو ہم ہیں جو سوچتے ہیں۔

میرا سلسلہ پھر ٹوٹ جاتا ہے —

گاڑی کا دوسرا چکہ سامنے آجاتا ہے۔ چکر چوں چکر چوں کی آواز کانوں میں رینگنے لگتی ہے۔

جب چکے بے میل ہو جاتے ہیں تو گاڑی کا منزل تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا — گاڑی گڈھے میں الٹ سکتی ہے۔ حادثہ کا سبب ہو سکتی ہے۔

میں بھی ایسے ہی بے میل پہیے سے جڑا ہوں۔

گاڑی سے ایک پہیہ نکال دیا جائے تو — ؟

گاڑی رک جائے گی۔ منزل دور ہو جائے گی۔ پھر — پھر — اور یہ پھر پھیل کر بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ دائرے بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایک معمولی سی کنکری بہت بڑا دائرہ بنانے کا سبب بن سکتی ہے اور وہ دائرہ ساحل سے ٹکرا کر اپنا وجود ختم کر دیتا ہے۔ کنکری موجود رہتی ہے تاکہ دوسرے دائرے بنیں۔ دائرے — دائرے — مسلسل دائرے —

"کیا یہ زندگی صرف سوچنے کے لئے ہی ہے — ؟"

اس نے پوچھا تھا — میں کیا جواب دیتا۔ وہ اکثر ایسی ہی باتیں کہہ جاتی ہے جس کا جواب میرے پاس نہیں ہوتا۔

کتنی پاگل ہے یہ لڑکی — پیار کرتی ہے — کتنا عجیب ڈھنگ ہے اس کا۔ اور اس کا اپروچ بھی کتنا مختلف ہے۔ ہاں وہ یقیناً مجھ سے مختلف ہے۔

"پھر یہ ہم آہنگی کیسی — ؟" ایک سوال سر اٹھاتا ہے۔

ہم آہنگی صرف اس لئے ہے کہ وہ جب سامنے ہوتی ہے میں نہیں ہوتا۔
صرف وہی ہوتی ہے۔ دوئی مٹ جاتی ہے۔ اور اکائی — اکائی، اکائی
ہوتی ہے بس —"

میں گھر سے بھاگ کر سکون تلاش کرتا ہوں۔ غم دور کرنا چاہتا
ہوں۔ اور جب واپس ہوتا ہوں — خود کو ہی گم کر آتا ہوں۔

نلنی، مجھ سے میرے "میں" کو چھین لیتی ہے اور خود اکائی بن جاتی ہے۔
میں خالی ہاتھ لوٹتا ہوں۔ بالکل ہلکا پھلکا۔ سوچتا ہوا۔ جب کہ ذہن میں
کچھ نہیں ہوتا ہے۔ کچھ ہوتا ہے۔ اس کی کہی ہوئی باتیں رہ جاتی ہیں۔
ذہن کے دیواروں میں جذب ہو جاتی ہیں۔

آج بھی ذہن کے خالی گوشے اس کی باتوں سے بھرے پڑے ہیں۔
ساری باتیں جذب ہو گئی ہیں۔ اور ایک ہی جملہ بار بار ذہن میں گونج
رہا ہے۔

"ہاتھ دھونا پڑتا — ہاتھ دھونا پڑتا۔ ہاتھ...."

سارے الفاظ ذہن میں گھل گئے ہیں صرف ہاتھ رہ گیا ہے۔ اور
یہ ہاتھ پھیل کر کافی لمبا ہو جاتا ہے۔ آسمان میں اڑتے ہوئے پرندے
کو پکڑنا چاہتا ہے جو اپنے وجود سے بے نیاز اڑتا جاتا ہے۔ منزل سے
بے خبر — پروں کو پھیلائے۔

"پیار کا یہ کون سا انداز ہے؟"

"اِس احساس کو آخر کون سا نام دیا جائے؟"

"پوجا — ؟ نہیں —"

یہ مقدس جذبہ تو بے نام ہے۔ اسے نام دے کر میلا نہیں کیا جا سکتا۔

"جانتے ہیں آپ — ؟"

وہ مسکراتی ہوئی میری جانب دیکھ رہی ہے۔ آج وہ بہت ہی خوش دکھائی دے رہی ہے۔

"جانتے ہیں آپ — میں نے کل صبح سے اب تک دانہ پانی کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

"برت رکھا ہے تم نے —؟" میں بھی مسکرا پڑا ہوں۔

"برت —؟ ہاں برت ہی سمجھئے۔ دوسرا نام کیا دوں اسے — اور پھر برت بھی تو بھگوان کے لئے ہی رکھا جاتا ہے نا۔؟"

وہ مسکراتی نہیں۔ پہلی بار سوچ رہی ہے۔

"کس سوچ میں گم ہوگئیں —؟"

"گم نہیں ہوئی۔ بلکہ گم ہونا چاہتی ہوں۔ یہ بھوک پیاس کا جذبہ مٹ کیوں گیا؟ یہی سوچ رہی ہوں۔"

"تو واقعی تم نے کچھ نہیں کھایا —؟"

"ہاں واقعی —" وہ مسکرانے لگی ہے۔

"ممی کافی پریشان ہوئیں مگر میں مسرور تھی۔ بھوک کا احساس تک نہیں تھا۔"

"کیوں آخر —؟"

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ہتھیلیوں کو میری ہتھیلیوں کے درمیان رکھا — انگلیوں کو میری انگلیوں میں الجھا کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر بولی۔

"جانتے ہیں آپ —؟"

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"کل میں نے اپنی ہتھیلیوں میں آپ کے لمس کو قید کرلیا تھا۔ ہتھیلیوں

سے ہوتی ہوئیں لمس کی یہ کرنیں میرے انگ انگ میں سرایت کر گئی تھیں۔

یہ میری زندگی کا پہلا اور انوکھا تجربہ تھا۔

میری ہتھیلیوں میں لمس کا سورج قید تھا۔

میں اس لمس کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

"اور کھانے کے لئے ہاتھ دھونا پڑتا ۔۔۔ اور ہاتھ دھوتے ہی لمس کا یہ سورج میری ہتھیلیوں سے پھسل پڑتا تو ۔۔۔ تو ۔۔۔؟"

اس کی گرفت میری ہتھیلیوں پر مضبوط ہو گئی ہے۔ سخت بہت سخت۔ اور میں خلا کی وسعتوں میں گھور رہا ہوں۔۔۔ شاید کچھ تلاش کر رہا ہوں۔

آسمان میں اڑتا ہوا پرندہ میری نگاہوں کی گرفت سے دور ہو گیا ہے ۔۔۔ اور میں ۔۔۔ نہیں نہیں ۔۔۔ میں وہاں کب ہوں۔ وہاں تو صرف نلنی ہے۔ اکائی کی صورت میں بس ۔۔۔!

●●

کہیں ایسا تو نہیں....

میں اپنے کمرے میں تالا لگا کر جیسے ہی سڑک کی جانب مُڑا کہ سامنے کے برآمدے میں وہ کھڑا مسکراتا ہوا نظر آیا۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے اسے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔

یہ تقریباً میرا روز کا معمول بن گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی تک نہ تو مجھے اس کا نام معلوم تھا اور نہ اس سے کسی قسم کی گفتگو ہی ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات کب ہوئی تھی یہ بھی اب یاد نہیں۔ یاد تو بس اتنا ہے کہ دفتر جاتے اور واپس آتے وقت وہ اپنے برآمدے میں کھڑا مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلاتا اور میں بھی اسی گرم جوشی سے اس کی محبت قبول کرتا۔ ہم دونوں کے درمیان خاموش محبت کا یہ رشتہ اتنا مضبوط تھا کہ اسے نہ تو کسی نام کی ضرورت تھی اور نہ زبان کی۔ معاملہ دل سے تعلق رکھتا تھا اور دل کا معاملہ دل ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

دراصل میں اپنے گھر اور اپنے بال بچوں سے کافی دور کشن گنج جیسے چھوٹے

سے شہر میں نوکری کر رہا تھا۔ یہاں سے میرا گھر کافی دور تھا اور صرف آنے جانے میں دو سو روپے سے زائد خرچ ہو جاتا تھا اور مجھ جیسے ایک بابو کلاس آدمی کے لئے برابر گھر جانا بہت مشکل تھا۔ وہاں اپنا ایک کھپریل کا جھونپڑا تھا اور ماں زندہ تھی۔ ایک چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہی تھی۔ اگر بیوی بچوں کو اپنے ساتھ بلا لیتا تو خرچ بڑھ جاتا۔ جو میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ جب بھی گھر جانے کا ارادہ کرتا کوئی نہ کوئی پینڈنگ کام سامنے آجاتا اور میں گھر نہ جاکر رقم ہی بھیج دیا کرتا۔ پرب تیوہار میں تو جانا ضروری ہوتا تھا۔ بچوں کی یاد بھی بہت آتی ـــ خاص کر گڈو تو بہت یاد آتا۔ چار پانچ سال کا پیارا گڈو میری کمزوری تھا۔ میں جب بھی گھر جاتا اس کا پورا وقت میرے ساتھ ہی گزرتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے پہلی بار اسے اپنے سامنے کے برآمدے میں کھڑا دیکھا تو مجھے گڈو کی یاد بے ساختہ آئی وہ بھی اسی عمر کا رہا ہوگا۔ میں نے اسے ہاتھ ہلا کر ٹاٹا کہا تھا اور وہ بھی بہت گرمجوشی سے ہاتھ ہلانے لگا تھا۔ بس اس کے بعد سے یہ سلسلہ چلا تو چلتا ہی رہا۔

اسے میرا اور مجھے اس کا انتظار رہنے لگا تھا، کبھی کبھار مجھے دفتر سے آنے میں تاخیر ہو جاتی تو وہ مجھے وہاں نہ ملتا۔ ظاہر ہے وہ مایوس ہو کر اندر چلا جاتا ہو گا۔

اب تک نہ تو مجھے اس کا نام معلوم تھا اور نہ یہ کہ اس کے ساتھ اور کون کون لوگ رہتے ہیں۔ ایک دن میرے دفتر کے ہی شاکر بھائی نے بتایا کہ وہ بچہ کسی انور صاحب کا لڑکا ہے۔ جو آسام میں کسی پرائیویٹ فرم میں نوکری کرتے ہیں، یہاں ان کی بیگم یہ لڑکا اور ایک چھوٹی بچّی کے علاوہ انور صاحب کا چھوٹا بھائی رہتا ہے۔ جو کسی کالج کا اسٹوڈنٹ ہے۔ لیکن زیادہ تر وقت دوستوں کے ساتھ خرمستیوں میں گزارتا ہے۔

شاکر بھائی ہی نے بتایا کہ اس بچّے کا نام بھی گڈو ہے۔ پھر کیا تھا میری محبت نے جوش مارا اور ایک دن میں نے اسے گڈو کہہ کر پکار لیا۔ وہ بہت خوش ہوا پھر جھجکتے ہوئے

میرے پاس آیا۔ مجھے دفتر جانے کی جلدی تھی لیکن میں نے اسے جی بھر کے پیار کیا اور ڈھیر ساری باتیں کیں جب میں اس سے باتیں کر رہا تھا ایک سایہ کھڑکی کے پاس آیا پھر غائب ہو گیا۔ غالباً وہ گڈو کی امی تھیں کیوں کہ چھوٹی بچّی کے رونے کی آواز بھی آئی تھی۔ میں نے نہ انھیں کبھی دیکھا تھا اور نہ یہ تجسس ہی تھا کہ وہ کون ہیں اور کیسی ہیں؟

گڈو کی محبت نے میرے دل میں اپنے بیٹے گڈو کی یاد پر پھاہے کا کام کیا اور میں کبھی کبھار اس کے لئے ٹافیاں بھی لانے لگا۔ ایک دن اس نے ٹافی لینے سے انکار کرتے ہوئے بتایا۔

"امّی دوسروں کی چیز لینے سے منع کرتی ہیں۔"

میں نے اسے سمجھایا کہ بیٹا میں تمہارا انکل ہوں دوسرا نہیں۔ لیکن وہ نہ مانا۔ جب میں نے ضد کی تو بولا۔

"رکیئے ـــــ میں امی سے پوچھ کر آتا ہوں۔" پھر وہ اندر بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر آکر بولا۔

"آج لے لیتا ہوں۔" پھر اس نے کہا ـــ "انکل ـــ آپ برابر ٹافی کیوں لاتے ہیں؟" اس کے اس معصوم سوال کا میرے پاس جواب نہیں تھا۔

میں نے اس کے چھوٹے انکل یعنی انور صاحب کے چھوٹے بھائی کو کبھی نہیں دیکھا۔ ہم دونوں کے کوارٹر کے سامنے ایک پتلی سی سڑک تھی۔ میں دھن پورہ لاج کے ایک کمرے میں رہتا تھا اور سامنے کے فیملی کوارٹر میں گڈو اپنی ماں اور انکل کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے پوچھنے پر گڈو نے بڑی معصومیت سے بتایا تھا۔

"انکل کب آتے ہیں مجھے تو پتہ ہی نہیں ـــ کبھی کبھی تو میں انھیں کئی دن نہیں دیکھتا۔"

شاکر بھائی نے بتایا تھا کہ اس پر کسی کا کنٹرول نہیں ہے۔ ـ بے چاری بھابھی کر بھی کیا سکتی ہے۔ بھائی پڑھائی کے لئے رقم بھیجتا ہے اور وہ اسے دوستوں کے ساتھ موج مستی

میں برباد کرتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ شاید ان دنوں وہ ڈرگ بھی لینے لگا ہے۔ مجھے کافی حیرت ہوئی اور مجھے اپنا چھوٹا بھائی یاد آیا۔ میں بھی تو اسے صرف رقم بھیج دیا کرتا ہوں۔ ماں کو نماز روزے سے ہی واسطہ رہ گیا ہے۔ چھوٹی بہن صابرہ ابھی دسویں میں پڑھتی ہے۔ اس سے بڑا ہے اکرم ۔۔ پتہ نہیں وہ کالج جاتا ہے یا نہیں؟ جاتا بھی ہے تو کیا کرتا ہے یا پھر کالج کے بہانے وہ بھی دوستوں کی محفل میں رنگ رلیاں ہی مناتا ہے۔

سوچا اب کی بار جب گھر جاؤں گا تو پوری تحقیق کروں گا۔ میرا درد اور گڈو کے والد انور صاحب کا درد یکساں تھا اور مجھے لاشعوری طور پر ان سے ایک نامعلوم سی ہمدردی ہونے لگی۔ وہ بے چارہ بھی میری ہی طرح گھر کم ہی آپاتا ہے۔ آسام تو میرے گھر سے دوگنا سے بھی زیادہ دوری پر ہے۔ پتہ نہیں پرائیویٹ فرم میں کتنا ملتا ہوگا۔ ایک بار گھر آنے جانے میں پانچ سو سے زائد ضرور لگتا ہوگا ان کا۔

ان سے ہمدردی محسوس ہوئی تو سوچا ان کا چھوٹا بھائی اگر کبھی مل گیا تو میں اسے ضرور سمجھاؤں گا کہ بھائی کی عزت کی لاج رکھو اور خود کو یوں برباد نہ کرو۔

یہ درد مشترک بھی عجیب شئے ہے، بغیر کسی رشتے کے ایک رشتہ سا بن جاتا ہے۔ نہ جانے کتنے ایسے اور ہوں گے جو ہم لوگوں کی طرح ہی اپنے بیوی بچوں سے دور زندگی گذار رہے ہوں گے۔ مجھے تو اس گڈو کا ایک سہارا بھی ہے۔ پتہ نہیں انور صاحب کو وہاں کوئی گڈو جیسا ملا کہ نہیں ۔۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا کہ اگر کبھی ان سے ملاقات ہو گئی تو ڈھیر ساری باتیں ان سے کروں گا۔ ان سے یہ بھی دریافت کروں گا کہ آسام میں تو برابر کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوتی رہتی ہے پھر وہ وہاں ڈرتے نہیں؟ میں تو یہیں ڈرے ہوا ہوتا رہتا ہوں۔

آج جیسے ہی دفتر گیا صاحب نے بلا کر کہا۔

"خلیق صاحب دفتر کا انسپکشن ہونے والا ہے۔ پوری رپورٹ آج ہی تیار کردیں۔"

"بالکل کردوں گا سر۔ آپ بے فکر رہیں۔"

میں اطمینان سے کام میں لگ گیا۔ جون کی گرمی جان لیوا تھی لیکن کام تو کرنا ہی تھا۔ میں تندہی سے کام کرتا رہا۔ رپورٹ تیار کرنے میں اس طرح منہمک رہا کہ نہ تو وقت گذرنے کا احساس ہوا اور نہ ہی لنچ لینے کی سدھ رہی۔ لنچ کے نام پر بغل کے ہوٹل میں کچھ نہ کچھ زہر مار کرلیا کرتا تھا۔

میں جب رپورٹ دے کر صاحب کے چیمبر سے نکلا تو سات بجنے کو تھے۔ سڑک پر آیا تب پتہ چلا کہ بھوک بھی لگی ہے اور کافی تھکاوٹ کا بھی احساس ہو رہا ہے۔ راستے میں بنگالی دا کی دکان میں گرم گرم سموسے کھائے اور چائے پی کر پان کی ایک گلوری بھی منہ میں داب لی۔ میں عام طور پر پان نہیں کھاتا۔ بس کبھار موڈ ہوا تو میٹھے مسالے کے ساتھ پان کھا لیتا ہوں اور تاکید سے اس میں گل قند ضرور ڈلواتا ہوں۔

پان چباتے ہوئے میں اطمینان سے ٹہلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا۔ گڈو کے انتظار میں کھڑے رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس لئے میں سیدھا اپنے کمرے کی جانب مڑ گیا۔ ابھی چابی نکال ہی رہا تھا کہ گڈو انکل انکل کہتے ہوئے دوڑتا ہوا آکر مجھ سے لپٹ گیا۔ اور رونے لگا۔

اسے روتا دیکھ کر میں تو بوکھلا گیا۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے روتے ہوئے بتایا۔

" انکل امی کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے وہ کچھ نہیں بول رہی ہیں۔ پنکی رو رہی ہے۔ انکل جلدی چلئے۔ چلئے نا انکل ....."

میں حیرت میں پڑ گیا کہ مسز انور کو آخر کیا ہو گیا؟ "کہیں وہ مر تو نہیں گئیں۔؟" یہ خیال آتے ہی میں تقریباً دوڑتے ہوئے گڈو کو لے کر اندر چلا آیا۔

اندر دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں مسز انور بالکل بے سدھ حالت میں بے ہوش پڑی تھیں۔ میں نے پیشانی پر ہاتھ رکھا تو گھبرا گیا۔ بخار بہت تیز تھا اور ان کی سانسیں بھی بہت تیز چل رہی تھیں۔ چھوٹی بچی پنکی روتے روتے ہی سو گئی تھی لیکن نیند میں بھی وہ سسک رہی تھی۔

میں الٹے پاؤں پھرا اور ڈاکٹر مدنی صاحب کے یہاں دوڑ گیا۔ انھیں لا کر دکھایا۔ بخار ۱۰۴

سے زائد تھا۔ انھوں نے بتایا۔ یہ تیز بخار کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی ہیں۔ انھوں نے ایک انجکشن لگایا۔ کچھ گولیاں لکھیں ایک کیپسول بھی لکھا۔ اور سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھتے رہنے اور ہر آدھے گھنٹے پر ٹمپریچر لینے کی تاکید کر کے چلے گئے۔

میں دوائیاں لے کر آیا اور ان کے سر پر اپنے رومال کو پانی میں بھگو کر رکھنے لگا۔ بعد میں گڈو نے بتایا کہ ان کی طبیعت کئی دنوں سے خراب تھی۔ وہ بہت دنوں سے کھانس بھی رہی تھیں اور شام سے ہی بے ہوش پڑی تھیں۔

ان کے سر پر پٹی رکھتا رہا۔ اور اسی دوران جب میں نے انھیں غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بے حد خوبصورت عورت تھیں۔ دو بچوں کی پیدائش نے ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔ میں نے کافی جھجک بھی محسوس کی لیکن مجبوری کے پیش نظر ان کی تیمارداری بھی کرتا رہا۔

رات کے بارہ بجے کے بعد انھوں نے کروٹ لی۔ پھر کراہ کر اپنی آنکھیں کھولیں۔ مندی مندی آنکھوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔

"آپ کب آئے۔؟" پھر میرا ہاتھ اپنے گال کے نیچے لیتے ہوئے بولیں۔

"اگر آپ آج نہ آتے تو شاید میرا مرا منہ دیکھتے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ غلط فہمی اور نیم غنودگی میں مجھے شاید انور سمجھ رہی ہیں۔ میں نے اپنا ہاتھ ان کی گرفت سے دھیرے سے آزاد کراتے ہوئے بتایا۔

"میں آپ کے سامنے والا پڑوسی، گڈو کا انکل ہوں۔"

یہ سن کر وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں پھر نقاہت سے لڑھک گئیں۔ میں نے بڑھ کر انھیں سہارا دے کر تکیے پر ان کا سر رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اس طرح اچانک آنے کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل آپ کی طبیعت بہت خراب تھی اور گڈو مجھے یہاں لے آیا تھا۔ آپ آرام سے لیٹی رہیں اور یہ دوا لے لیں۔"

نہ جانے کیا سوچ کر وہ رونے لگیں ۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ان سے کیا کہوں؟ اتنی رات گئے میرا ان کے کمرے میں رہنا بھی عجیب سا لگ رہا تھا لیکن انھیں چھوڑ کر جانا بھی غیر اخلاقی بات ہوتی ۔ میرے دل میں کوئی چور نہیں تھا اس لئے میں نے صاف صاف کہہ دیا ۔

" دیکھئے مسز انور ۔ آپ مجھے غلط نہ سمجھیں ۔ اگر آپ کا دیور یہاں ہوتا تو میں خود ہی چلا جاتا یا آتا ہی نہیں ۔ آپ کو کافی بخار تھا اور آپ بے ہوش بھی تھیں اس لیے میں یہاں رکا رہا ۔ آپ یہ دوا لے لیں ۔ اب بخار بھی کچھ کم ہے ۔ پندرہ منٹ قبل بخار ۱۰۲ تھا ۔ اب شاید اور کم ہو جائے ۔ آپ یہ دوا لے لیں ۔ میں اب چلتا ہوں ۔"

انھوں نے میری بات سن کر ایک بار میری جانب دیکھا ۔ نہ جانے ان کی نگاہوں میں کیا تھا کہ میں گنگ ہو گیا ۔ ان نگاہوں میں تشکر تھا، التجا تھی، یا پھر دردمندی ۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا ۔

انھوں نے بڑی مشکل سے دوا لی ۔ پھر بچی کو اٹھا کر اپنے قریب کر لیا ۔ گڈو پائتانے پڑا پڑا ہی سو گیا تھا ۔ اس پر انھوں نے ایک نظر ڈالی پھر بہت دھیمی آواز میں بولیں ۔

" میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو بہت پریشانی ہوئی ۔ اب میں بہتر ہوں ۔ آپ بھی اب جا کر آرام کریں ۔"

میں جب وہاں سے نکلا تو رات کا ایک بج رہا تھا ۔ اور چاروں طرف سناٹے کی حکمرانی تھی ۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر پڑا رہا ۔ لیکن نیند غائب تھی ۔ جب بھی آنکھیں بند کرتا بیگم کی شبیہہ لہرانے لگتی ۔ طرح طرح کے خیال آتے رہے ۔ نہ جانے گھر میں کون کس حال میں ہو ۔ یہی سب سوچتا رہا نہ جانے کس وقت آنکھ لگی ۔ جب آنکھ کھلی تو دن کے دس بج رہے تھے ۔ بدن میں درد بھی ہو رہا تھا ۔ میں نے سی ۔ ایل کی درخواست بھیج دی اور بستر میں ہی پڑا رہا ۔

اچانک رات کا حادثہ یاد آیا ۔ پھر جھٹ پٹ غسل کیا اور تیار ہو کر گڈو کے یہاں گیا ۔ دستک دینے پر گڈو نے ہی دروازہ کھولا ۔ میں نے باہر سے ہی اس کی امی کا حال دریافت کر کے واپسی کا ارادہ کیا کہ اتنے میں گڈو نے پکار لیا ۔

"انکل ـــ امی اندر بلا رہی ہیں۔"

میں اندر گیا تو انھوں نے سلام کر کے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر میری تیمارداری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ۱۰۰ روپے کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"رات آپ نے بہت زحمت کی۔ ڈاکٹر کی فیس اور دوا کی قیمت بھی اپنے پاس سے ہی ادا کی ہوگی۔ یہ رقم رکھ لیں۔"

میں نے بہت انکار کیا لیکن وہ نہ مانیں۔ میں نے رقم لے لی اور دل ہی دل میں حساب کیا تو پتہ چلا کہ کُل ۷۵ = ۹۹ خرچ ہوئے ہیں۔ میں نے چونّی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"حساب سے یہ ۲۵ پیسے زائد ہیں اس لئے رکھ لیجئے۔" وہ مسکرائیں اور چونّی لے کر گڈو کو انعام میں دے دی۔

مسز انور سے یہ اتفاقیہ ملاقات ایک انسیت میں بدل گئی۔ پھر بھی میں بہت کم ہی ادھر کا رخ کرتا۔ صرف گڈو سے خیر خبر لیتا۔

ایک دن میں دفتر سے لوٹا تو گڈو نے کہا۔

"انکل آج رات کا کھانا آپ ہمارے یہاں کھائیں گے۔"

"ہاں ـــ ؟ کس خوشی میں بھائی۔"

"انکل ـــ اب امّی اچھی ہو گئی ہیں نا۔ اس لئے۔" اور پھر اس نے دھیرے سے کہا۔

"جانتے ہیں انکل۔ آج مرغا بنا ہے اور پلاؤ بھی بنے گا۔"

میں اس کے بھولپن پر مسکرایا۔ اور اپنے کمرے میں آگیا۔ نہ جانے کیوں آج بیگم اور بچّوں کی یاد بہت آرہی تھی۔ میں نے ایک طویل خط بیگم کو لکھا اور یقین دلایا کہ اس بار آؤں گا تو زیادہ دن رکوں گا اور ـــ

آٹھ بجتے بجتے گڈو سر پر سوار ہو گیا۔

"چلئے نا انکل ـــ مجھے تو نیند آجائے گی ـــ میرے ساتھ کھائیے نا۔"

میں اس کے ساتھ آگیا۔ اکیلی مسز انور کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ میری آمد پر وہ مڑیں

تو گڈو نے کہا۔

" امی انکل کو لے آیا ہوں۔ آپ کھانا بنائیے۔ میں ان سے کہانی سنوں گا۔" وہ مسکرا کر اپنے

کام میں مصروف ہوگئیں۔

کھانا واقعی وہ بہت لذیذ بناتی تھیں۔ اس کھانے نے بھی گھر کی یاد کے ساتھ بیگم کی یاد

تازہ کردی۔ کھانا کھا کر گڈو تو فوراً سو گیا بلکہ اس کا سر میری گود میں ہی رکھا تھا۔

پھر اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت گذرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ میں نے جب گھڑی

دیکھی تو گیارہ بج رہے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور ان سے معذرت کی جو انھوں نے رد کردی۔

"آپ تو ہر بات میں اس طرح معذرت کرتے ہیں گویا قصور ہی سرزد ہوگیا ہو۔ اتنی بھی

غیریت کیا۔؟"

میں لاجواب ہوگیا۔

ان سے گفتگو کا سلسلہ پھر چل نکلا۔ اور نہ جانے کب اور کیسے وہ کمزور سا لمحہ ہمارے

درمیان آگیا جب اچانک سارے بندھن ایک ساتھ ٹوٹ گئے اور وہ سب ہوگیا جس کے لئے

نہ میں تیار تھا اور نہ ہی وہ۔

"پھر یہ سب کیسے ہوگیا؟" میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نظریں چرائے جب

باہر نکلا تو مجھے احساس ہوا کہ جیسے اس اندھیرے میں بھی ہزاروں نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں۔

میں بھاری بھاری قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک خیال

ذہن میں کوندگیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں..... ایسا تو نہیں.... کہ میرے گھر سے میری ہی طرح کوئی اور نکل

رہا ہوگا....."

●●
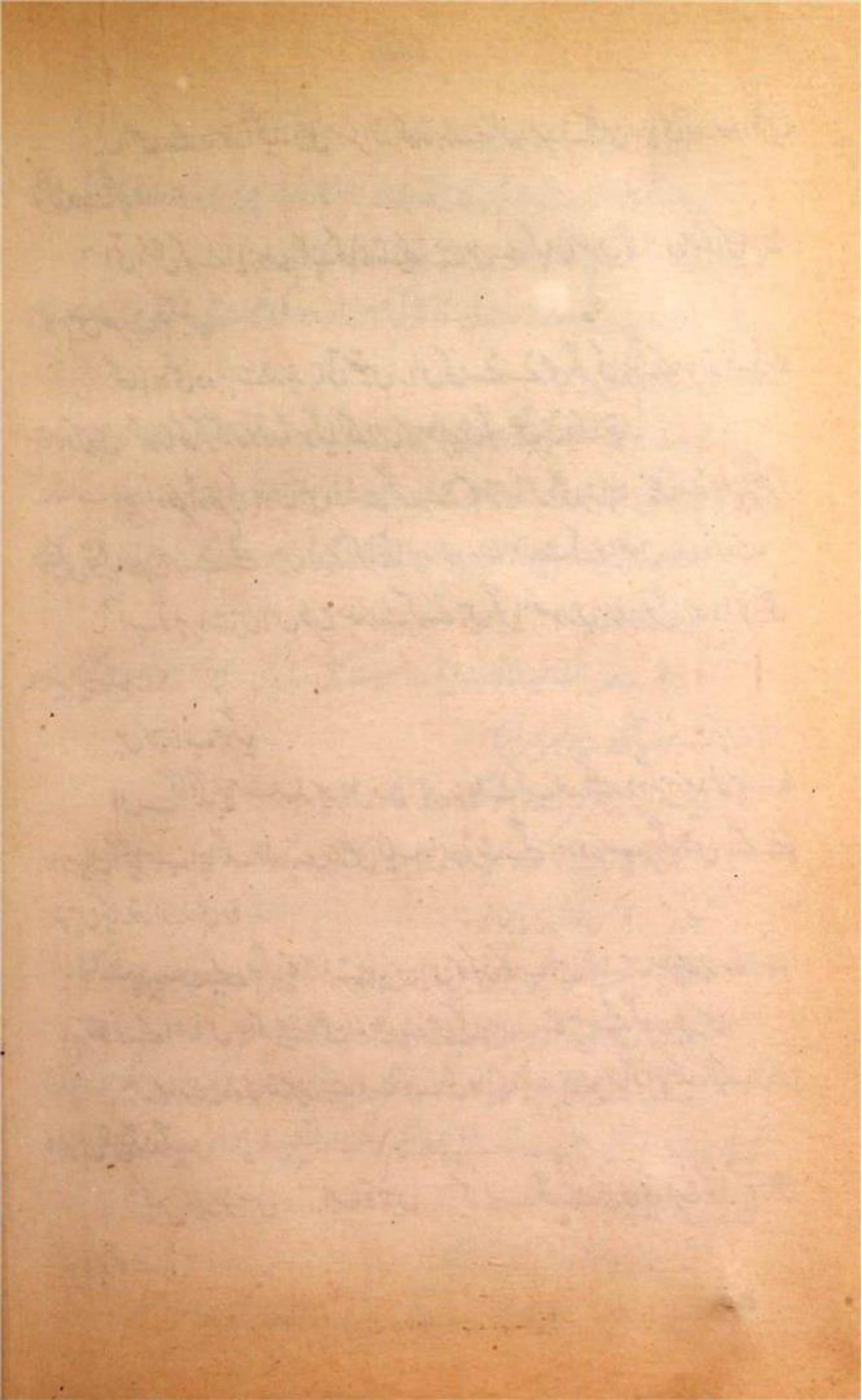
پتھر کی لکیر

مرزا وجاہت حسین دیوان خانے میں بہت بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ ان کے دونوں ہاتھ پشت پر تھے اور مٹھیوں میں کاغذ کا ایک ٹکڑا دبا ہوا تھا جس پر مرزا کی گرفت شدید تھی۔ دیوان خانے کے اس مخملیں فرش پر چلتے ہوئے بھی انہیں کانٹوں کے چبھن کا احساس ہو رہا تھا جس نے ان کی روح تک کو زخمی کر دیا تھا۔ ان کے دل میں کیا تھا یہ تو معلوم نہیں مگر ان کے چہرے پر پورا نوابی جلال جلوہ افروز تھا اور جلال کے چلمن سے دل کا درد جھانکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ فرش پر ٹہلتے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے، کبھی کبھی کچھ بڑبڑانے بھی لگتے، مگر آواز اتنی صاف نہیں تھی کہ سنی جا سکتی۔ اسی درمیان انور مرزا دیوان خانے

میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"مرزا بابا آپ یہاں ہیں اور میں آپ کو اِدھر اُدھر بہت دیر سے تلاش کر رہا ہوں کیونکہ......"

ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی انور کی زبان پر بریک لگ گیا اور وہ تقریباً چیخ پڑا۔

"مرزا بابا ——!" مرزا صاحب نے انور کی طرف اس طرح دیکھا گویا آج پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا پسینے کے ننھے قطرے عجیب شانِ بے نیازی سے ان کے سرخ و سفید چہرے پر چمک رہے تھے۔ انور ان کی یہ حالت دیکھ کر چونک پڑا تھا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔

"مرزا بابا — آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

مرزا صاحب اب بھی انور کو ہی دیکھے جا رہے تھے۔ جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں پھر وہ بھی چونکتے ہوئے بولے۔

"آں — تم نے کچھ کہا بیٹے۔؟"

"آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔"

"ہاں بیٹے —" مرزا صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی کا باپ ہوں نا — اسی لئے —"

ان کی آواز میں ایک عجیب سا درد تھا جسے انور نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ وہ اپنے طور پر بولا۔

"مرزا بابا — ہر باپ کو یہ دن دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ بیٹی ہوتی ہی ہے پرائی — والدین کی محبت و شفقت کے سائے تلے پروان چڑھتی ہے اور ایک دن سب کی آنکھوں کو آنسوؤں کا سوغات دے کر چلی جاتی ہے۔

گلیاں چھوڑ جاتی ہے۔"

"ہاں بیٹے — یہ سچ ہے بالکل سچ — انہوں نے ایک لمبی آہ بھری پھر بولے۔"

لیکن بیٹے میرا درد یہ بھی نہیں ہے۔ جدائی کی اس جان لیوا گھڑی کے لئے میں اسی دن سے تیار تھا جس دن خوشبو اس دنیا میں آئی تھی۔ اس دن کے لئے تو ہر باپ لاکھوں لاکھ جتن کرتا ہے۔" وہ خاموش ہوئے پھر انور کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"ہر درد کی الگ پہچان ہوتی ہے بیٹے — ہر درد کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ہوتے۔"

"ممکن ہے آپ شادی کی تیاریوں کے لئے متفکر ہوں۔ آپ اس کی فکر بالکل نہ کریں۔ آپ کے ہاتھوں سونپی گئی یہ ذمہ داری میرے لئے بہت عظیم ہے۔ میں سب سنبھال لوں گا اور آپ کے بھروسے کو ٹھیس نہیں لگنے دوں گا۔"

"میں جانتا ہوں بیٹے تم سب سنبھال لوگے مجھے تم پر خود سے زائد بھروسہ ہے۔ خیر چھوڑو، تم بتاؤ مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے۔"

انور مرزا صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں اور میرے خیال میں یہی "کچھ" آپ کی پریشانی کی وجہ ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس تردد کا اظہار کردیں، ممکن ہے اس خاکسار کے ذہن میں مسئلہ کا حل ہو۔"

"مسئلہ کا حل —؟" مرزا صاحب چونکے پھر انور کی طرف گہری

نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"ہاں مسئلہ کو حل بھی تم ہی کرو گے بیٹے یہ مجھے معلوم ہے۔" پھر وہ دیوان خانے کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"میری پریشانی کا سبب کاغذ کا یہ حقیر سا ٹکڑا ہے۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے کاغذ کا وہ ٹکڑا انور کی طرف بڑھا دیا۔ انور اسے کھول کر پڑھنے لگا۔

محترم مرزا صاحب تسلیمات

ایک بہت ضروری کام کے سلسلہ میں یہ خط تحریر کر رہا ہوں۔ آپ اسے چھوٹا منہ بڑی بات بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنے جگر کا ٹکڑا آپ کے حوالے کیا ہے۔ آج کے دور میں خاندانی آئی، اے، ایس داماد قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ اور آپ تو شروع سے ہی خوش نصیب رہے ہیں۔

عزیزی وقار مرزا کو آپ نے بہت سی چیزیں جہیز میں دینے کا فیصلہ کیا ہے مگر اس میں کار کا ذکر نہیں تھا۔ ایک آئی، اے، ایس داماد کو کار نہ دینا بہت بڑی سبکی کی بات ہوگی۔

اسے آپ داماد کی خواہش سمجھیں یا فرمائش۔ مگر میری طرف سے اگر برا نہ مانیں تو شرط ہی تسلیم کریں کیوں کہ یہ میری عزت کا بھی سوال ہے نا؟

خاکسار افتخار مرزا

خط پڑھ کر انور کا چہرہ بھی تمتما گیا مگر وہ ضبط کرتا ہوا بولا۔

ہم لوگ تو کار دے ہی رہے ہیں پھر اس خط کا مطلب ؟"

بیٹے یہ عقل کا پھیر ہے۔ ان لوگوں نے سب کچھ خود ہی مانگ لیا تھا۔ میں نے سوچا اپنی طرف سے کار دے کر انہیں سرپرائز دوں گا مگر یہ لوگ تو بہت لالچی اور گرے ہوئے نکلے"۔

وہ خاموش ہو گئے اور خلا میں گھورتے ہوئے بولے۔

" ان کی اس اوچھی حرکت سے میں بہت نالاں ہوں سوچ رہا ہوں کہ اس رشتے سے ۔۔۔۔"

نہیں ۔ نہیں ۔۔" انور درمیان میں بول پڑا۔

آپ ایسا نہیں کر سکتے بابا۔ ہمارے خاندان میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پھر آپ کی زبان کا کیا ہوگا ۔۔؟ دنیا جانتی ہے کہ مرزا وجاہت حسین کی زبان سے نکلی ہوئی بات کمان سے نکلے تیر کی طرح ہوتی ہے۔ چاہے گردن کٹ جائے مگر بات نہیں ٹلتی"۔

" ہاں بیٹے ۔۔ یہی سوچ کر تو چپ ہوں۔ اب تو میں بس پرکھوں کا وقار ہی ڈھو رہا ہوں"۔

ان کے خاموش ہوتے ہی انور نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

" اس بات کو ذہن سے نکال دیجئے اور ذرا اس فہرست پر ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔

یہ سارے سامان گھر لائے جا چکے ہیں۔ فریج، رنگین ٹی وی، وی سی آر، اور ماڈرن ترین صوفہ سیٹ کی قیمت دی جا چکی ہے۔ تمام تک

ڈیلوری مل جائے گی ۔۔۔ وہ رُکا پھر گویا ہوا۔

"کار کے لئے پیشگی دی جا چکی ہے۔ کونٹیسا کا بالکل نیا ماڈل ہے۔ اور خوشبو کی پسند کے مطابق رنگ بالکل سفید ہے۔۔"

مرزا صاحب نے انور کی بات سنی اور فہرست اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"تمہیں رپورٹ دینے کی ضرورت کیا ہے۔ ساری ذمہ داری تو میں نے تمہیں سونپ دی ہے پھر مجھے اس بکھیڑے میں کیوں کھینچ رہے ہو۔۔؟"

یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر مسکراہٹ تیر گئی اور انور کی جان میں جان آگئی اور وہ انہیں چھوڑ کر باہر آگیا۔ انور کے جانے کے بعد مرزا صاحب سوچ کے دلدل میں دھنستے چلے گئے۔

مرزا وجاہت حسین خاندانی نواب تھے۔ گو کہ نوابی کا دور کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اب تو صرف نام کے ساتھ لفظ نواب ہی باقی تھا۔ اس دور میں بھی مرزا صاحب خاندانی وقار باقی رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ ان کی اولادوں میں اصغر مرزا بڑے تھے مگر بیماری نے انھیں کہیں کا نہ رکھا تھا۔ پولیو کے مرض نے بچپن میں ہی انہیں اپاہج بنا دیا تھا۔ اس کے بعد بڑے جتن سے خوشبو پیدا ہوئی تھی۔ اور مرزا صاحب کی ساری توجہ خوشبو پر ہی مرکوز ہو گئی تھی۔ خوشبو واقعی خوشبو تھی۔۔ ویسی ہی نازک۔ ذہانت اور نفاست تو بس اس پر ختم تھی۔ ابھی مہینہ بھر قبل ہی اس نے انگریزی ادب میں ایم اے کا امتحان دیا تھا۔ اسے ریزلٹ کی فکر قطعی نہیں تھی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ٹاپ اسے ہی کرنا ہے۔ مرزا صاحب گریجویشن کے بعد ہی اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے مگر خوشبو ہی نہ

مانی۔ اور کسی طرح دو سال اور گذر گئے۔ مرزا صاحب وقتی طور پر مان گئے تھے۔ مگر اندر ہی اندر موزوں رشتے کی تلاش میں بھی رہے۔ اور جیسے ہی وقار مرزا کی نسبت آئی انہوں نے فوراً منظوری دے دی۔

وقار مرزا۔۔۔ افتخار مرزا کے صاحبزادے تھے۔ افتخار مرزا بھی خاندانی آدمی تھے۔ اور انہوں نے اپنی جوانی اور دولت ایک ساتھ برباد کی تھی پھر بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوئے تھے۔ نوابی تو چلی گئی تھی مگر وقار کی شکل میں بہت بڑا خزانہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے آئی اے ایس ہوتے ہی جلدی سے انہوں نے اسے کیش کر والینا ہی بہتر سمجھا۔

وجاہت مرزا دو بھائی تھے۔ حشمت مرزا ان سے بڑے تھے۔ الگ ہوتے ہی حشمت کی حالت بگڑتی گئی تھی کیونکہ چار لڑکیوں کی شادی پورے وقار کے ساتھ انجام دینا کھیل نہیں تھا۔ پھر انور مرزا کی پڑھائی الگ تھی۔ وجاہت مرزا کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی بیگم باپ کی اکلوتی تھیں اس لئے سسرال کی ساری دولت انہیں کے حصے میں آئی تھی۔ اسی وجہ سے نوابی جاہ و جلال کو برقرار رکھنے میں وہ اب تک کامیاب رہے تھے۔

انور مرزا بچپن سے ہی بہت سنجیدہ اور نفاست پسند تھا۔ اس کی زیادہ تر عادتیں اپنے چچا وجاہت مرزا پر گئی تھیں۔ انہیں کی طرح بات کا دھنی بھی تھا۔ پورے چھ فٹ کا جوان۔۔۔ رنگ ایسا کہ لڑکیاں شرما جائیں۔ وہ ہمیشہ سفید رنگ کے کپڑے پہنتا تھا۔ شاید سفید رنگ سے اس عشق نے ہی اس کے جسم پر نیوی کی سفید وردی چڑھائی تھی۔ امتیازی کامیابی نے بہت جلد اسے اونچا عہدہ عطا کیا تھا۔

انور اور خوشبو بچپن سے ساتھ پلے اور بڑھے تھے گرچہ خوشبو انور سے پانچ چھ سال چھوٹی تھی۔ ان کے مزاج میں ایسی ہم آہنگی تھی کہ حیرت ہوتی تھی۔ انور کی طرح خوشبو پر بھی سفید رنگ کا بھوت سوار تھا۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی اس رنگ کو خود میں جذب کرلیا تھا۔ اس کے کمرے کے سارے پردے، بیڈ شیٹ ٹیبل کلاتھ اور گلدان تک سفید ہی تھے۔ حتیٰ کہ گلدان میں رجنی گندھا کے سفید پھول ہی مسکراتے ہوئے ملتے تھے۔ اسے دیکھ کر پاکیزگی کا وہ تصور ابھرتا کہ فرشتے بھی پانی بھرنے لگیں۔ اور جہاں تک خوشبو کے قد و قامت کی بات ہے تو شاید اس کے اظہار کے لئے اردو کو نئے الفاظ تراشنے ہوں گے۔

دونوں نے بچپن سے جوانی کے حدود میں قدم رکھا اور کب ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے اس کا احساس انھیں بھی نہ ہوسکا۔ ایک ہی جگہ رہ کر یہ پاکیزہ محبت اس طرح خاموشی سے پروان چڑھی کہ کسی کو بھنک نہیں مل سکی۔ خود انور کو بھی احساس نہیں تھا کہ واقعی خوشبو بھی اسے اسی شدت سے چاہتی ہے جتنی کہ وہ۔۔۔ وہ تو اس دن اچانک اس کی محبت کا راز کھل گیا تھا جب وہ پہلی بار نیوی کی سفید براق جیسی وردی پہن کر گھر آیا تھا اسے دیکھتے ہی خوشبو پاگل ہوگئی تھی۔

"ہائے اللہ۔ انو۔۔۔ یہ تم ہو۔۔۔؟" پھر وہ شرماتی ہوئی بے اختیار بول اٹھی تھی۔

"تم اس وردی میں اتنے حسین لگ رہے ہو کہ میری خواہش ہے کہ تم اس رات بھی اسی وردی میں رہنا جس کے لئے لڑکیاں ہزار رات کے تارے گنتی ہیں۔"

اور یہ کہتی ہوئی وہ بھاگ گئی تھی اور انور نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ دونوں کی یہ محبت گرچہ انہیں کے درمیان تھی مگر ہلکی سی بھنک مرزا صاحب کی بیگم کو بھی تھی آخر تو بیٹی کی ماں تھیں اور ایک زمانہ دیکھا تھا۔ خوشبو کے ہاؤ بھاؤ سے انہوں نے اندازہ کر لیا تھا اور دل ہی دل میں مطمئن تھیں کہ چلو گھر کی دولت گھر میں ہی رہے گی۔

لیکن اچانک دونوں کی معصوم محبت کے آشیانے پر مرزا صاحب کے قول کی بجلی گر پڑی تھی۔ مرزا صاحب نے وقار مرزا کے رشتے کو پہلی ملاقات میں ہی باریابی بخش دی تھی۔ رشتہ ہر لحاظ سے موزوں تھا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ وقار مرزا کے گھر سے خوشبو کو کیا لینا۔ وہ تو شوہر کے ساتھ ہی نگری نگری گھومتی رہے گی۔ اس لئے انہوں نے زبان دینے کے بعد ہی گھر کے افراد کے سامنے سرپرائز کے طور پر اس رشتے کا اعلان کیا تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ انجانے میں ان سے اتنا بڑا گناہ سرزد ہو جائے گا جسے خدا بھی معاف کرنے سے ہچکچائے گا۔

انور نے اس اعلان کو سن کر اندر ہی اندر ضبط کر لیا تھا کیونکہ ان حالات میں محبت کا اظہار محبت کی رسوائی تھی۔ اس نے اندر کی آگ باہر نہیں آنے دی تھی مگر خوشبو اڑ گئی تھی کہ زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کرنے سے قبل اس سے دریافت کرنا ضروری تھا۔ اس کی اس دلیل کو مرزا صاحب نے بھی تسلیم کیا تھا مگر اب تو ان کے قول کا سوال تھا اور مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑی تھی۔ جتنا غم خوشبو کو تھا اس سے کم مرزا صاحب کو نہیں تھا مگر اب وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ انہوں نے انور کے سامنے اپنی نظریں جھکا کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تھا۔

خوشبو تو بالکل بکھر کر رہ گئی تھی۔ اس نے بڑے دکھ سے انور سے کہا تھا۔

"انو۔۔ آج تمہاری خوشبو بے گھر ہو گئی۔۔ اب سارے غنچے خوشبو کو ترس جائیں گے کیونکہ اب تو خوشبو صحرا کی امانت ہونے جا رہی ہے۔"

مگر انور نے بڑے عزم سے کہا تھا۔

"نہیں خوشبو۔۔۔" خوشبو بے گھر نہیں ہو سکتی۔ وہ تو میری سانسوں میں بس گئی ہے۔ اور جب تک یہ سانس قائم ہے خوشبو کے بے گھر ہونے کا سوال ہی نہیں۔"

انور کے سمجھانے پر وہ کچھ دیر کے لئے نارمل ہو سکی تھی، پر زخم اتنا گہرا اور کاری تھا کہ اس کے بھرنے کے لئے صدیاں درکار تھیں۔

شادی میں صرف ہفتہ بھر کی دیر تھی۔ سارے انتظامات انور کے ذمے تھے اور وہ بہت ہی خوش اسلوبی سے انہیں انجام دے رہا تھا۔ سمندر کی سطح پر زندگی گذارنے والا نوجوان سمندر کی گہرائی بھی اپنے دل میں رکھتا تھا اس لئے کسی کو یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ انور کے دل پر ہر ہر قدم پر کیا قیامت بیت رہی تھی۔

ابھی ابھی وہ مرزا صاحب کے پاس سے گیا تھا اور مرزا صاحب یہ سب سوچتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔

مجھے معاف کرنا میرے بچو۔۔ میں اندھا ہو گیا تھا۔ اتنا آب دار موتی سمندر کے حوالے کر دیا۔ میں دیکھ ہی نہیں پایا۔۔ اور جب آنکھ کھلی تو اسے اپنانے سے قاصر ہوں۔

ان کی بوڑھی نظریں اس حادثے سے اور بھی بوڑھی ہو گئی تھیں

وہ بہت ہی ملول تھے۔ رہی سہی کسر افتخار مرزا کے خط نے پوری کردی تھی۔ اور اب تو وہ ایسا محسوس کر رہے تھے کہ زندگی کے آخری دور میں انہوں نے زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرتے وقت زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی. مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔

ان کے دل میں بار بار یہ خیال آیا ضرور تھا کہ اپنے اصول توڑ دوں۔ زمانے بھر کی بدنامیاں اپنے سر لے لوں۔ خاندانی وقار کو خاک میں ملادوں۔ اور اپنی بلند و بالا شخصیت کو پستی میں گرادوں تاکہ معصوم دلوں کو سکون نصیب ہو جائے — مگر ان کی بوڑھی شخصیت میں اتنا جوان حوصلہ کہاں سے آتا — ؟ اب تو سامنے صرف ان کی زبان تھی۔ ہارا ہوا قول تھا۔ وہ قول جو پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ اور ہر زمانے میں جس کی مثال پیش کی جاتی تھی۔ اب تو اسے بدلنے کا اختیار خود انھیں بھی نہیں تھا کیونکہ یہ تو پرکھوں کی امانت تھی۔

آج بارات آنے والی تھی۔ صبح سے ہی سب چست درست تھے۔ انور مرزا پھرکی کی طرح ناچا پھر رہا تھا اور ہر انتظام پر آخری بار تنقیدی نگاہ ڈال رہا تھا کہ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔

شام کو بارات بہت ہی شاندار طریقے سے دروازے لگی۔ وقار مرزا دلہا کی شکل میں غضب ڈھا رہے تھے۔ استقبال کرنے والے دوڑ پڑے۔ انور مرزا نے لپک کر وقار مرزا کو گھوڑے سے اتارا اور مسند پر لاکر بیٹھا دیا۔

باراتیوں کی تواضع شروع ہو گئی۔ شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے مگر ہر جگہ روشنی ہی روشنی بکھری ہوئی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سارے سائے سمٹ کر دلوں میں پناہ گزیں ہو گئے ہوں۔ ناشتے کے بعد شادی کا انتظام ہونے لگا۔ جہیز کے سارے سامان باراتیوں کے

سامنے سجا دیئے گئے۔ افتخار مرزا ایک ایک سامان دیکھ کر باراتیوں کو فخریہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر سارے سامان کو دو ٹرک میں پیک کر دیا گیا۔ اور پھر ایک بہت ہی خوبصورت سفید رنگ کی کونٹیسا کار دلہن کی طرح سرخ پھولوں سے سجی ہوئی شامیانے کے نیچے آکر رکی۔ جس نے بھی دیکھا دنگ رہ گیا۔ افتخار مرزا نے وقار مرزا کی طرف دیکھا اور دونوں کی آنکھیں ایک ساتھ چمک اٹھیں۔

قاضی صاحب تشریف لا چکے تھے۔ اب لڑکی سے اجازت کے لئے اندر جانا تھا۔ اس سے قبل مرزا صاحب کی اجازت ضروری تھی۔ انور چھت سے دیوان خانے کی طرف گیا اور انہیں سہارا دے کر شامیانے میں لایا۔ مرزا وجاہت حسین کے آتے ہی سارے لوگ ان کے استقبال اور احترام میں کھڑے ہو گئے۔ مرزا صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بیٹھنے کو کہا پھر ایک طائرانہ نگاہ سارے مجمع پر ڈالی۔ پھر ان کی نگاہیں دلہن بنی کار پر مرکوز ہو گئیں۔ سارے لوگ مرزا صاحب کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے جنھیں شادی کے لئے رسمی طور پر اجازت مرحمت فرمانا تھی۔

مرزا صاحب نے ایک نظر دولہا وقار مرزا پر ڈالی اور پھر قاضی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بہت ہی مطمئن اور بارعب آواز میں گویا ہوئے۔

"قاضی صاحب ـــــ آپ عزیزی وقار مرزا کی شادی دلہن بنی اس کار سے کر دیں اور خوشبو کو عزیزی انور مرزا کے نکاح میں دے دیں۔"

اتنا کہتے ہوئے پر سکون انداز میں وہ دیوان خانے میں تشریف

لے گئے۔ سارے مجمع پر سکتہ طاری ہو چکا تھا کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ مرزا وجاہت حسین کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ پتھر کی لکیر ہوتا ہے ——!!

••
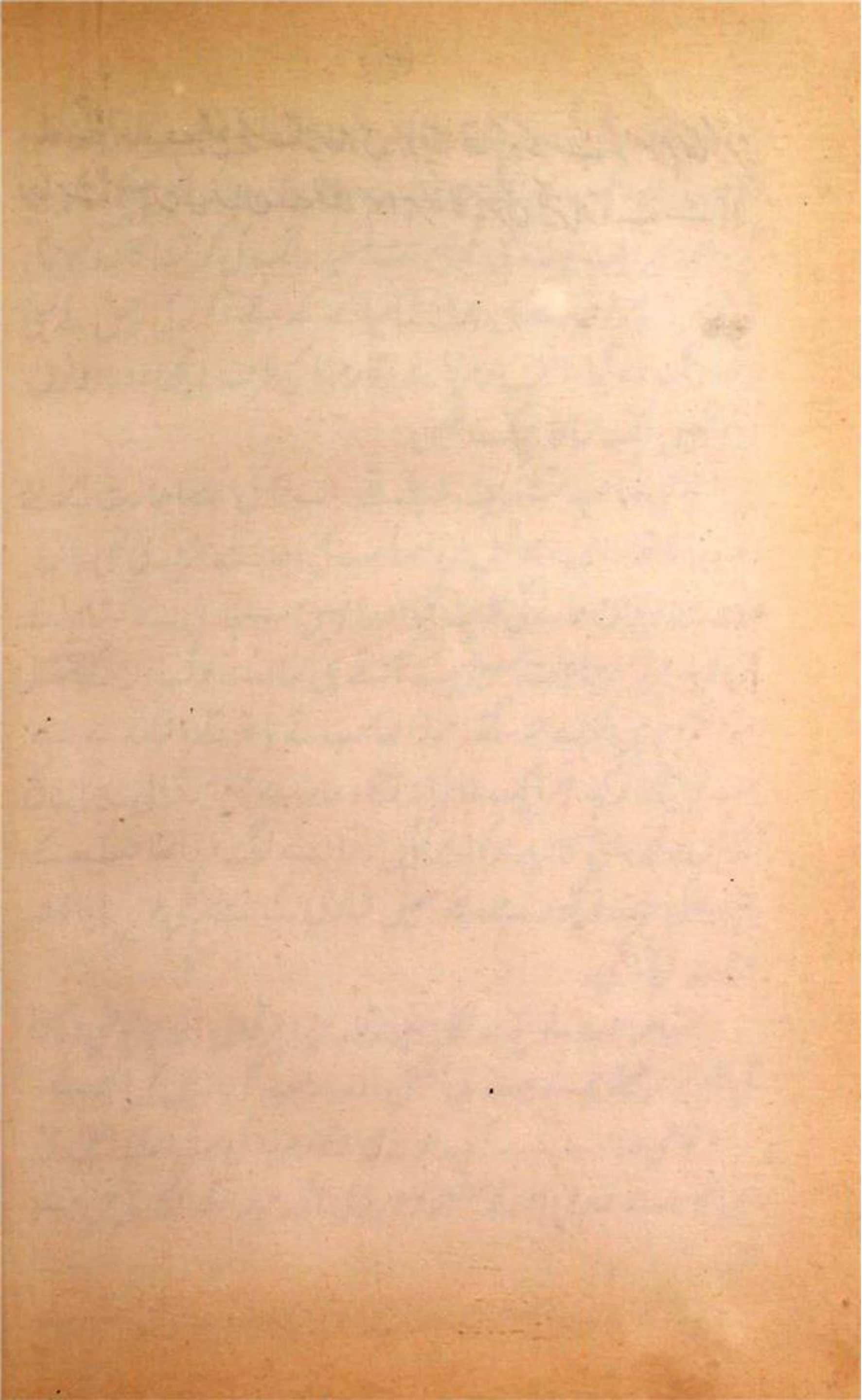
بند آنکھوں کا سفر

میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ ایک رومانی کہانی لکھوں۔۔
رومان کا نام ذہن میں آتے ہی میرے جسم کا رواں رواں گدگدا اٹھتا ہے
اور دل کے دھڑکنے کا انداز ہی بدل جاتا ہے۔ اور تم یہ بھی جانتی ہو ڈولی
کہ میری رومانی کہانی میں تمہارے علاوہ دوسری لڑکی کا تصور بھی نہیں
ہو سکتا اور یہ بھی سچ ہے کہ میں تمہارے تذکرے کے بغیر رومانی کہانی
لکھ بھی نہیں سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس رومانی کہانی کو شروع کہاں سے کروں؟
سوال معمولی ضرور ہے مگر اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔
رومانی کہانی میں رومانی فضا ہو، گل و بلبل کی بات ہو، شام کی
سلگتی لالی کا ذکر ہو اور الفاظ کے رومانی ذخیرے کا بھرپور استعمال ہو،

تب ہی تو وہ رومانی کہلائے گی۔ اور ہاں اس میں فلمی تھرل بھی ضروری ہے۔

"اچھا ڈولی — ہم لوگ اس رومانی کہانی کے ابتدائی صفحات کو کھولتے ہیں۔"

"مگر... مگر... ہم لوگوں کا رومان شروع کب ہوا تھا؟"

"لو— گاڑی تو پہلے جھٹکے میں ہی رک گئی — اسی ایک سوال نے الجھا دیا۔

"کیا واقعی ہم لوگوں کے درمیان رومانی رشتہ تھا بھی — ؟"

اب بتاؤ جواب کیا ہوگا — ؟

ویسے تو اس کا سیدھا سادا سا جواب ہاں اور نہیں میں دیا جاسکتا ہے۔ مگر نہیں — یہ سوال اتنا بھی معمولی نہیں ہے جتنا لگ رہا ہے۔ شاید میں بھی اس کا جواب نہ دے پاؤں۔

ویسے یہ ضروری بھی تو نہیں کہ ہر سوال کا کوئی جواب بھی ہو — کچھ سوال لاجواب بھی تو ہو سکتے ہیں۔ تو ایسا کیوں نہ کریں کہ اس کہانی کو درمیان سے ہی شروع کر دیتے ہیں۔

"درمیان — ؟"

یعنی درمیانی حصہ اس رومانی کہانی کا —

دیکھو اب گاڑی اٹکاؤ نہیں ورنہ قاری بدظن ہو جائیں گے۔ ان کا رومانی تصور بھی خاک میں مل جائے گا اور ہماری یہ کہانی بھی ادھوری رہ جائے گی اس لئے جھٹ سے کوئی واقعہ سامنے لاؤ جس میں تھرل ہو، رومان ہو اور —

دسر۔ محکمے کے کچھ لوگ راجدھانی سے آئے ہوئے ہیں ضروری کام کے سلسلہ میں آپ سے مشورہ کرنا ہے۔

توبہ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ یہ سرکاری لوگ بھی عجیب واہیات ہوتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی موقع محل ہے وارد ہونے کا۔ انہیں سوچنا چاہئے کہ اتنے دنوں بعد تو بیٹھا ہوں رومانی کہانی لکھنے۔ اور ابھی کہانی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ تم نے مداخلت شروع کردی۔ اب خاک لکھی جائے گی یہ کہانی۔ بڑی مشکل سے تو دفتر کے رومانی ماحول کا میں فائدہ اٹھا رہا تھا مگر۔۔۔۔

چلو۔ ان لوگوں کو جلدی نپٹا دیا۔ اب سرکار کے کس کس مسئلے کو میں حل کرتا پھروں گا؟ اپنے مسئلوں سے فرصت ملے تو ادھر بھی دیکھوں۔ وہ راجدھانی سے آئے تھے۔ اس سے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکہ ہوا اور تم بے ساختہ یاد آگئیں۔ ارے تم تو سامنے ہی ہو دراصل وہ درمیان والی بات یاد آگئی۔

میں اکثر راجدھانی جاتا رہا ہوں اور ہر بار تمہارے کالج ضرور جاتا ہوں۔ لو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ــــــــــــــــ؟ میں جانتا ہوں بابا کہ تمہیں کالج چھوڑے ایک عرصہ ہو چکا ہے مگر میں پھر بھی جاتا ہوں اور کون جانے کب تک جاتا رہوں گا۔

ہاں بات دراصل یہ تھی کہ میں جو ایک بار گیا تو دنگ ہی رہ گیا۔ وہ جگہ بالکل بدل سی نظر آئی۔ تمہارے ہاسٹل کے سامنے والی بلڈنگ کے شیڈ میں جو بوگن ویلیا کی جھاڑی تھی نا جہاں ہم لوگ گھنٹوں بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ باتیں کیا خاک کرتے تھے زیادہ تر وقت تو بس خاموش رہنے میں ہی گذر جاتا تھا۔ ممکن ہے ہماری آنکھیں باتیں کرتی

ہوں مگر ایسا بھی شاید نہیں ہوتا تھا۔ تمہاری آنکھیں اپنے اس انگوٹھے کو دیکھ رہی ہوتی تھیں جس سے نم زمین کریدا کرتی تھی۔ اور میری آنکھیں پتہ نہیں کیا کرتی تھیں؟ ممکن ہے وہ بھی تمہارے انگوٹھے پر مرکوز ہوتی ہوں۔ بات یوگن ویلیا کی جھاڑی کی ہو رہی تھی جو اَب وہاں سے غائب تھی۔ وہ جھاڑی ہمارے درمیان کے بے شمار رومانی لمحات کی گواہ بھی تھی۔ مگر اب وہ کاٹ کر پھینک دی گئی تھی اور اس بلڈنگ میں ایک بینک کی برانچ کُھل گئی تھی۔

میں اس شیڈ میں جا کر نگاہیں نیچی کر کے تمہارے انگوٹھے سے کریدے ہوئے نشانات تلاش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ان لمحوں کو بھی اپنی گرفت میں لینا چاہتا تھا جو وہیں کہیں پڑے رہ گئے تھے۔ مجھے کچھ تلاشتے ہوئے دیکھ کر ایک بینک کرم چاری نے پوچھا۔

"کیوں صاحب۔ کچھ تلاش کر رہے ہیں؟"

میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا اور نہ ہی اس کی طرف دیکھا تھا صرف گردن ہلا کر ہاں کر دی تھی۔ اس نے پھر دوسرا سوال داغ دیا۔

"کیا تلاش کر رہے ہیں؟ اور وہ چیز کب گم ہوئی تھی۔"

"لمحے ۔۔۔ جو برسوں قبل میری ہتھیلیوں سے اسی جگہ پھسل پڑے تھے"۔

پتہ نہیں میں نے اس سے سچ کیوں کہہ دیا ۔۔۔ اور تم جانتی ہو کہ لوگ سچ کو قبول نہیں کر سکتے اور سچ کہلانے والے شاید پاگل بھی کہلانے لگتے ہیں۔ اس نے بھی مجھے پاگل ہی سمجھا تھا شاید کسی دوسرے کو میری طرف دکھا کر اشارہ بھی کیا تھا۔ میں وہاں سے چلا آیا تھا مگر بار بار ذہن میں یہی سوال اٹھ رہا تھا۔

کیا واقعی وہ لمحے وہیں پڑے ہوں گے یا ہواؤں نے انہیں اڑا کر گنگا میں بہا دیا ہوگا۔ اور وہ سارے لمحے پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے کون جانے

کہاں تک نکل گئے ہوں۔"

"وہ لمحے اب بھی تیر رہے ہوں گے؟ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی گرداب نے انہیں اپنی کوکھ میں سما لیا ہو۔"

"کچھ بھی ہو سکتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا واقعی وہ لمحے میری گرفت سے پھسل گئے تھے؟"

میں جانتا ہوں تم اس کا جواب نہیں دو گی۔ اور پھر بھلا تمہیں معلوم بھی کیوں کر ہوگا کہ وہ لمحے پھسلے بھی تھے؟ ہاں اگر تمہاری گرفت سے پھسلے ہوئے ہوتے تو تم جواب بھی دے سکتی تھیں۔ وہ تو میری ہتھیلی سے پھسلے تھے۔ ممکن ہے میری گرفت ہی کمزور رہی ہوگی۔ اچھا چھوڑو اس بحث کو، ورنہ میری کہانی بھی میری گرفت سے پھسل جائے گی۔

:

ہاں تو ــــ

اُف ــ دیکھو پھر ان دفتر والوں نے ڈسٹرب کر دیا ــــ

چپراسی ڈھیر ساری فائل میرے سر پر پٹخ گیا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ ان کم بختوں کو یہ شعور تو ہونا ہی چاہئے تھا کہ آج صاحب برسوں بعد رومانی کہانی لکھنے بیٹھے ہیں۔ اس لئے ان سب کو مدد کرنی چاہئے۔ سارا کام وقت پر ہی کر لیا جائے یہ ضروری تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ہمارے اس دیش کا کیا ہوتا۔ ہمارے لیڈر کو کچھ بھی کرنے کو نہیں ملتا۔ نہ ہڑتال ہوتی اور نہ ہی جلوس نکلتے۔ نہ انشن ہوتا اور نہ ہی ستیہ گرہ ــ پھر لیڈر کیا کرتے۔ اور چونکہ ہمارا دیش لیڈروں کا دیش ہے۔ انہیں کے ذریعے چلتا ہے، انہیں کے لئے چلتا ہے اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ہر کام وقت پر نہ کیا جائے۔ اس لئے میں بھی آج کا کام کل پر ڈال کر ڈیرے کا

رخ کرتا ہوں تاکہ اطمینان سے کہانی مکمل کر سکوں۔

"ہاں تو ڈولی رانی — رومانی کہانی کے تصور سے دل کے دھڑکنے کا انداز ہی بدل جاتا ہے — تو یہ دل کس جگہ دھڑک رہا تھا۔؟"

"درمیان سے۔"

"اجی سنتے ہیں۔ دفتر سے آتے ہی یہ کیا لکھنے بیٹھ گئے۔ جب گھر کا کام دفتر میں کرنے کی اجازت نہیں تو پھر آپ دفتر کا کام گھر میں کیوں لے آتے ہیں؟"

اب اس نیک بندی کو کون سمجھائے کہ یہ دفتر کا کام نہیں ہے۔ رومانی کہانی ہے مگر وہ بے چاری رومانی کہانی سمجھے گی نہیں۔ ان دس سالوں میں وہ رومان سے کوسوں دور رہی ہے۔ ہاں تو میں —

"ابو — یہ کیا ہے؟" گڈو اپنی کتاب لیئے کھڑا ہے۔

یہ ایچ ای اے آر ٹی کیا ہوتا ہے ابّو؟" وہ مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

"بیٹا یہ ہارٹ ہوتا ہے اسے دل کہتے ہیں" میں اس سے پنڈ چھڑانا چاہتا ہوں۔

"ابو دل کیا ہوتا ہے؟"

"بیٹا دل دل ہوتا ہے۔ گوشت کا ایک لوتھڑا۔

"اس دل میں کیا ہوتا ہے؟" یہ لونڈا ابھی اب مجھے گھسیٹنے لگا ہے۔

"دل میں خون ہوتا ہے۔ دھڑکنیں ہوتی ہیں۔"

"دھڑکنیں —؟ یہ کیا ہوتی ہیں ابّو —؟"

لو۔ اب میں اسے دھڑکنوں کا حساب دوں؟ اس بالشت بھر کے لونڈے نے وہ سوال پوچھ لیا جس کا جواب میں نے کسی کو نہیں دیا ہے۔

"لو بھائی، اپنے لونڈے کو سمجھاؤ، یہ مجھ سے دل کی دھڑکنوں کا حساب مانگ رہا ہے"۔ میں اسے روانہ کر کے دفتر کا رخ کرتا ہوں اور اپنے چیمبر میں آکر دروازہ اندر سے بند کر کے چپراسی سے کہہ دیتا ہوں کہ میں اندر نہیں ہوں۔ چپراسی میری بات سمجھ جاتا ہے اور زیرِ لب مسکرانے لگتا ہے۔ ویسے چپراسی لوگ ہوتے بہت سمجھ دار ہیں۔ صاحب کے دل کی بات فوراً سمجھ جاتے ہیں مگر وہ صرف زیرِ لب ہی کیوں مسکراتے ہیں؟ شاید وہ اس سے زیادہ مسکرا بھی نہیں سکتے۔ بے چارے کے حصے میں اتنی ہی مسکراہٹ آتی ہے۔ جو صرف زیرِ لب ہو سکتی ہے بر لب نہیں ہو سکتی۔

اب میں مکمل اطمینان سے موونگ چیئر پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اب ڈسٹرب کیئے جانے کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ کہانی مکمل کرنے کا نشہ مجھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ میں ایک سکون بھری طویل انگڑائی لیتے ہوئے کمرے کے در و دیوار پر نظر ڈالتا ہوں۔

سامنے ہمارے وزیرِ اعظم کی تصویر ہے۔ دائیں طرف ان کی مرحومہ ماں کی ـــ اور بائیں ان کے نانا کی ـــ اور میرے پیچھے کس کی تصویر ہے۔؟ ان کے دادا کی ہو گی ـــ مگر نہیں شاید والد کی ہے ـــ نہیں نہیں وہ بھی نہیں ہے تو پھر کس کی ہے؟ تصویر تو ضرور ہے میں یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں مگر کس کی ہے؟ دماغ پر بہت زور ڈالتا ہوں مگر مایوس رہتا ہوں۔

کاش ہمارے پیچھے بھی آنکھ ہوتی تو کتنا آسان ہوتا۔ کم از کم دماغ پر زور ڈالے بغیر ہی ہم بہت کچھ کہہ سکتے تھے۔ آسانی سے بتا سکتے تھے کہ پیچھے کی تصویر کس کی ہے مگر پیچھے تو آنکھ نہیں ہے اس لئے ایسا سوچنے

سے فائدہ ۔۔۔؟

"اگر پیچھے دیکھنا ضروری ہوتا تو وہاں بھی آنکھ ضرور ہوتی۔"

آنکھیں صرف سامنے ہیں اور اس کے سامنے دیوار ہے جس پر وزیر اعظم کی مسکراتی تصویر ہے ــــ

"اس تصویر کی مسکراہٹ بھی زیر لب ہی ہے یا ـــ؟"

اچانک یہ سوال میرے ذہن میں ڈنک مارنے لگتا ہے مگر میں اس معاملہ میں نہیں پڑوں گا ورنہ میری کہانی کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکے گی۔ مسکراہٹ بس مسکراہٹ ہوتی ہے اس کو زیر اور زبر سے کیا مطلب ـــ؟

نہ جانے کیوں خواہ مخواہ کی باتیں ذہن میں در آتی ہیں۔

میں بار بار کہانی کو درمیان سے کھڑی کرتا ہوں مگر وہ پیچھے کی طرف لڑھک جاتی ہے لگتا ہے اس کی ریڑھ کی ہڈی ہی کمزور ہے۔ اس لئے سیدھی کھڑی نہیں ہو سکتی۔

مگر رومانی کہانی میں تو لوچ ہوتا ہے۔ نزاکت ہوتی ہے۔ ایک جذباتی بہاؤ ہوتا ہے ساتھ ہی فلمی تھرل بھی ـــــ

"اتنی چیزوں کے رہتے ہوئے ریڑھ کی ہڈی کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

اس لئے اب میں پھر اس کہانی کو درمیان سے ہی شروع کرتا ہوں۔

تو بات لمحوں کے گرفت سے پھسل جانے کی ہو رہی تھی کہ لونڈے نے دل کی دھڑکن کا حساب مانگ لیا ـــ اس کے بعد ـــ اس کے بعد۔

"ٹرن ــ ٹرن ــ ٹرن ــ"

کس کم بخت نے اس بدتمیز ٹیلی فون کی ایجاد کی تھی اگر اس وقت سامنے ہوتا تو میں یہ فون اٹھا کر اس کے سر پر ضرور مار دیتا۔ میں بے دلی

سے چونکا اٹھا تا ہوں اور کافی رعب دار آواز میں بولتا ہوں۔

ہلوؔ۔۔۔ تھری سیون فور۔۔۔

"صاحب ہیں۔۔۔؟"

"بول رہا ہوں۔۔۔" آواز مزید رعیبلی ہو جاتی ہے۔

"سر۔۔ میں کلکٹر کا پی اے بول رہا ہوں۔ کلکٹر صاحب آپ سے بات کریں گے۔"

میرا وجود ڈھیلا ہو جاتا ہے اور گردن دائیں طرف لڑھک جاتی ہے جدھر مرحومہ ماں کی تصویر ہے۔ پھر گردن سامنے جھک جاتی ہے جدھر وزیر اعظم کی تصویر ہے اور ادھر سے ہلو سنتے ہی میری آواز مکھن جیسی ملائم ہو جاتی ہے۔

آداب سر۔۔۔ میں بول رہا ہوں سر۔۔۔ ہاں سر۔۔۔ جی سر۔۔۔ جی کچھ نہیں سر۔۔۔ بس ذرا دل کی دھڑکنوں کا حساب کر رہا ہوں۔"

ارے یہ کیا۔؟ سارا کباڑہ ہو گیا۔ میں جلدی سے بات بناتا ہوں۔

"۔۔۔ او نو سر۔۔۔ آئی ایم ویری سوری سر۔۔۔ دراصل میں بل کا حساب کر رہا تھا۔ پے منٹ چیک کر رہا ہوں۔ جی سر۔۔۔ بس ابھی ختم کئے دیتا ہوں۔۔۔ جی بس آیا ہی سمجھئے سر۔۔۔ سر۔۔۔ سر۔۔۔"

میں جھٹکے سے فون رکھ دیتا ہوں۔ چہرے سے ساری ملائمت غائب ہو جاتی ہے اور میں نفرت سے فون کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی جلدی سانسیں لینے لگتا ہوں۔ شاید گفتگو کے دوران میں سانس لینا ہی بھول گیا تھا۔

اب مجھے جلدی ہے۔ بہت جلدی۔ معاملہ سخت ہے اور جان عزیز۔

لگتا ہے کچھ ہو گیا ہے مجھے جھٹ پٹ اسپارٹ پر پہنچنا ہے ـــــ شاید لوگوں کو اچانک اپنے مذہب کی یاد آ گئی ہے ـــــ

یہ عبادت گاہوں کا چکر بھی خوب ہوتا ہے۔ ساری عبادت گاہیں پتھروں سے تعمیر کی جاتی ہیں ان میں مورتیاں بھی پتھر کی ہی ہوتی ہیں۔ کہیں مریم کا وجود ہوتا ہے کہیں کرشن اور شنکر کا ـــــ اور کہیں ـــــ

پتھروں سے تعمیر کی گئیں ان عبادت گاہوں میں پتھروں کی کمی کیوں رہ جاتی ہے کہ لوگوں کو بعد میں اس پر پتھر پھینکنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

یہاں بھی شاید کسی نے پتھر ہی پھینکا ہے ـــــ

کس نے پھینکا ـــ؟

کس پر پھینکا ـــ؟؟

کیوں اور کب پھینکا ـــ؟؟؟

ایک پتھر نے اتنے سارے سوالوں کو جنم دے دیا۔ پتھر نہ ہوا جنم داتا ہو گیا۔ مگر اس کا جواب کون دے گا؟ مجھے تو فرصت بالکل نہیں ـــ ذرا بھی وقت نہیں ہے میرے پاس۔ اگر وقت ہوتا تو میں الٹ کر پیچھے کی تصویر نہ دیکھ لیتا؟

مجھے تو جلدی ہے ـــ اوپر کا حکم ہے۔ ذرا بھی دیر ہو گئی تو دو چار پتھر میری طرف بھی آ جائیں گے پھر کون جانے بے چارے پتھر میرے سر سے ٹکراتے ہی لہولہان ہو جائیں مگر میں انہیں لہولہان نہیں ہونے دوں گا اور جلدی سے حکم کی تعمیل کروں گا لیکن اس سے قبل مجھے اس کہانی کو مکمل کرنا ہے کیونکہ ڈر ہے کہ اگر ذرا بھی تاخیر ہو گئی تو شاید زندگی بھر میں اسے مکمل نہیں کر پاؤں گا۔

تو میری ڈولی رانی ۔۔ قصہ مختصر یہ کہ ہم دونوں زندگی کے ریگستان میں آگے کی طرف جا رہے تھے جہاں جھاگ بھرا سمندر اپنی اچھلتی لہروں کے ساتھ ہمارا منتظر تھا۔ میرے گلے میں مسجد کے مینار سے لٹکتا چاند تھا اور تمہارے گلے میں مندر کا کلس تھا۔ نہیں شاید چاند تمہارے گلے میں تھا اور کلس میرے گلے میں ۔۔ یا ۔۔ یا ۔۔ اب جو بھی ہو۔ مگر تھا ضرور جس کا بوجھ ہم دونوں ہی محسوس کر رہے تھے۔ پیاس کی شدت سے حلق خشک ہو رہا تھا اور سمندر کا جھاگ ساحلوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ہم صرف آگے بڑھتے جا رہے تھے ہمیں دائیں بائیں اور پیچھے ۔ ہاں پیچھے کی کبھی خبر نہیں تھی۔ سمندر کی جانب ہم تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے۔ کہ پیچھے سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ میں پلٹ کر دیکھ نہیں سکتا تھا کہ اگر دیکھ سکتا تو سب سے پہلے اپنے پیچھے کی دیوار میں ٹنگی تصویر ہی دیکھ لیتا۔

پیچھے سے آتے پتھروں نے ہمارے گلے میں لٹکے کلس اور چاند کو زخمی کر دیا۔ وہ ہمارے گلے سے ٹوٹ کر نیچے گر گیا اور ہم اس بوجھ سے نجات ملتے ہی اور تیز دوڑنے لگے تھے کیوں کہ ہمیں سمندر کی فکر تھی جو بس کچھ ہی دور رہ گیا تھا۔

دوڑتے ہوئے ہماری آنکھیں بند تھیں ویسے سفر کی ابتدا میں بھی ہماری آنکھیں بند ہی تھیں کہ اگر کھلی رہتیں تو اس سفر کی نوبت ہی نہ آتی۔

آنکھیں میں نے اس وقت کھولی تھیں جب میرے پاؤں میں نمی کا احساس ہوا تھا۔ ساحل کی نرم اور نم ریت کی خنکی پاؤں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اور اس خنکی کا احساس میری رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا۔

سمندر کے سامنے ہونے کا احساس ہوتے ہی میں نے پورے طور سے

اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔ واقعی سمندر میرے سامنے تھا اور اس کے درمیان تم تھیں ——— تم جو مجھ سے بہت تیز دوڑ گئی تھیں۔
میں کنارے پر تھا اور تم سمندر کے درمیان تھیں۔
میں آگے بڑھ نہیں سکتا تھا کہ سامنے ایک تصویر تھی جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور پیچھے بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہاں بھی ایک تصویر تھی جسے میں پلٹ کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔
کون جانے دیکھ لیتا تو امر ہو جاتا ———
یا پتھر کے بت میں تبدیل ہو جاتا ———

●●

جاڑے کی گلابی رات

گلابی جاڑے کا تصور کرتے ہی ایک عجیب سی رومانی فضا ذہن کے چاروں طرف بکھر جاتی ہے اور کمرے کے اندر انگیٹھیوں کے گرد کا رومانی ماحول آنکھوں میں لہرانے لگتا ہے۔ مگر جب دسمبر کی سرد ترین رات میں گیارہ بجے آنے والی ٹرین پکڑنی ہو اور وہ ٹرین چار گھنٹے دیر سے آرہی ہو تو سارا رومانی تصور خاک میں مل جاتا ہے۔

میں بھی پلیٹ فارم پر کھڑا، وہاں کی سرد ہواؤں کے تھپیڑے کی زد میں کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا اور ریلوے کی کارکردگی پر ماتم کرتا ہوا خود کو کوس رہا تھا۔ ٹکٹ اور ریزرویشن تو تھا مگر ٹرین ہی نہیں تھی۔ میری طرح بہت سے مسافر بھی ایسے ہی احساس سے دوچار ہو رہے تھے۔

کچھ اپنے سامان کے گرد ڈیرہ ڈالے بیٹھے تھے کچھ ہلکے پھلکے سامان والے اِدھر اُدھر ٹہل کر وقت گذار رہے تھے۔ بک اسٹال کے ساتھ ٹی اسٹال پر بھی کافی بھیڑ تھی۔

میرے پاس صرف ایک سوٹ کیس اور کمبل تھا۔ میں ادھر ادھر چہل قدمی کرتے ہوئے بوریت کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ چار گھنٹے چار صدی سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ اچانک وٹینگ روم کا خیال آیا اور میں تیز قدموں سے اس جانب لپکا۔ لیکن وٹینگ روم مسافروں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ پورے کمرے میں سیگریٹ کا دھواں اور دھوئیں کے دوش پر تیرتی ہوئی ان کی آوازیں موجود تھیں۔ میں خود کو اس بھیڑ میں گم کرنے کے لئے آمادہ نہ کر سکا۔ پھر ایک خیال بڑی سرعت سے ذہن میں رینگ گیا۔

"کیوں نہ لیڈیز وٹینگ روم پر قبضہ جمایا جائے۔"

اس ٹھٹھرتی ہوئی رات میں کسی بھی عورت کی موجودگی کے امکان کو رد کرتے ہوئے میں ادھر ہی لپکا اور لیڈیز وٹینگ روم کے دروازے پر پہنچتے ہی میرا سارا جوش سرد پڑ گیا۔ وہاں پہلے ہی سے تین لڑکیاں قبضہ جمائے بیٹھی تھیں اور میں نے ایک ہی نظر میں اندازہ کر لیا تھا کہ وہ تینوں اپٹوڈیٹ قسم کی لڑکیاں ہیں۔ میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا اور میں بغیر کچھ کہے وہاں سے لوٹنے لگا۔ تبھی ان میں سے ایک لڑکی نے مجھے بڑے مہذب انداز سے مخاطب کیا۔

"فرمائیے جناب۔ آپ کی کیا خدمت کی جا سکتی ہے؟ کم از کم یہاں تک آنے اور لوٹنے کی وجہ تو بتاتے ہی جائیں۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ یہ لڑکی نیلی جینز بادامی شرٹ اور اس پر ایک جیکٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ترشے بال اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ چہرہ بھی یقیناً خوبصورت تھا اور دہکتے ہوئے سرخ ہونٹوں پر تبسم کی کرنیں اس سردی میں بھی راحت کا احساس دلا رہی تھیں۔

جی وہ..... دراصل میں......"

"ہاں ہاں فرمائیے۔ شکل وصورت سے تو آپ خاصے شریف مسافر نظر آ رہے ہیں۔"

"مسافر تو خیر ہیں، مگر یہ تم نے شرافت کا سرٹیفکٹ کیسے دے دیا؟" دوسری لڑکی فوراً بولی۔

میں اس دوسری تیز وطرار لڑکی کی طرف غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے قدرے خوش اخلاقی سے کہا۔

"خیر جناب پہلے آپ اندر تشریف لے آئیں۔ میں نے اپنی ٹیلی پیتھی سے سب معلوم کر لیا ہے۔ اس سرد رات میں آپ کو وقت گذاری کے لئے کہیں جگہ نہیں مل رہی ہوگی۔ آپ نے سوچا ہوگا کہ چلو لیڈیز ویٹنگ روم تو خالی ہوگا اس لئے ادھر آ بھٹکے کیوں ــــ ہے نا یہی بات؟"

وہ یہ ساری باتیں اس طرح کہہ گئی جیسے واقعی وہ میرے ذہن کو پڑھتی جا رہی ہو۔ یہ لڑکی شلوار جمپر میں ملبوس تھی اور کارڈیگن کے ساتھ اس کے جسم پر ایک شال بھی تھا۔ اس دوران تیسری لڑکی نے، جو ساڑی پہنے اور کسی رسالے کے مطالعہ میں غرق تھی۔ پہلی بار میری جانب دیکھا اور پہلی لڑکی سے بولی۔

یہ تو وہی ہے!" بقیہ دونوں نے بھی میرے چہرے پر نظر ڈال کر اس کی

تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں، یہ تو واقعی وہی لگتا ہے۔"

باتیں بہت ہی دھیمے لہجے میں ہو رہی تھیں مگر یہ دو جملے ہی میرا خون خشک کر دینے کے لئے کافی تھے۔ میرے ذہن میں فوراً ایک خیال آیا۔ یقیناً کچھ دیر قبل کسی نوجوان نے ان لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ خانی کی ہو گی، اور اس لڑکے کی شکل اتفاق سے مجھ سے ملتی جلتی ہو گی اور اب یہ لوگ یہ سمجھ رہی ہیں کہ وہی لڑکا انہیں یہاں بھی چھیڑنے پہنچ گیا۔ مجھے اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی۔ یوں بھی میں بھڑ بھاڑ اور اس طرح کے حادثوں سے بہت گھبراتا ہوں۔ ہر وقت عزت کے آبگینے کی فکر لگی رہتی ہے۔ میری پیشانی پر پسینہ ابھر آیا اور میں وہاں سے الٹے پاؤں واپس ہونے والا ہی تھا کہ آواز آئی۔

"ہم لوگوں کے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ اینڈ فار یور کائنڈ انفارمیشن ہم لوگ مردم خور بھی نہیں ہیں۔ اس لئے اس سرد ٹھٹھری ہوئی رات میں بہتر یہی ہے کہ آپ ہماری پناہ میں آ جائیں۔"

"ہماری پناہ۔" پر کافی زور دیا گیا تھا۔ میں نے اپنے پہلے خیال کو ان کی شوخی سمجھ کر رد کر دیا اور "جل تو جلال تو۔" کا ورد کرتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ ابھی دو ہی قدم بڑھا ہوں گا کہ دوسری لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ ہماری موجودگی سے خوفزدہ نہیں ہیں تو براہِ کرم دروازہ بند کر دیں تا کہ سرد ہوا کے شوخ جھونکے مزید پریشان نہ کریں۔"

میں نے ایک نظر ان پر ڈالی اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے

خود کو تیار کرتا رہا۔ دروازہ بولٹ کرنے کے بجائے میں نے اسے بھیڑ دیا تھا اور دروازہ کے قریب کی کرسی پر قابض ہو گیا تھا۔ میرے انداز سے کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ میں ہر لمحہ دروازے سے نکل بھاگنے کے لئے تیار ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ میں ایسا پوز کرنے لگا تھا کہ میں قطعی خوفزدہ نہیں ہوں۔

دو چار لمحہ گذر جانے کے بعد میں نے ہمت کر کے ان لڑکیوں کی جانب دیکھا اور میری دو آنکھوں کو بیک وقت چھ آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میرا کلیجہ اس وقت تو دھک سے رہ گیا جب نیلی جینز والی لڑکی نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"محترم۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ ہم لوگوں کے قریب تشریف لائیں گے؟"

میری تو جان ہی نکل گئی۔ نہ جانے میں کس بلا میں گھر گیا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ پلیٹ فارم پر ہی ٹھٹھرتا رہتا۔ ان تیز و طرار لڑکیوں کے درمیان پھنس کر میں ایسا ہی محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی چوہا موٹی بلی کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ مجھے پس و پیش میں دیکھ کر دوسری لڑکی بولی۔

"آپ تو یوں گھبرا رہے ہیں گویا آپ کو خدشہ ہو کہ قریب آتے ہی ہم سب آپ پر حملہ کر دیں گے۔"

پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

میں واقعی ابھی تک اپنی حالت پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ ان لڑکیوں کی بولڈنیس اور بے تکلفانہ اندازِ گفتگو مجھے نروس کر دینے کے لئے کافی تھا۔ پھر بھی میں نے اپنی ساری ہمت جمع کی اور اپنے مرد ہونے کے احساس کو تازہ کرتے ہوئے اپنے مرتبے اور حیثیت کو یاد کیا اور اپنی چال میں خود اعتمادی اور وقار پیدا کرتے ہوئے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اور پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بڑے پر وقار انداز میں گویا ہوا۔

"فرمایئے۔ کیا خدمت کی جائے ــــ بندہ حاضر ہے۔"

"گڈ ــــ یہ ہوئی نا مردوں والی بات ــــ اب تک تو آپ لڑکیوں کی طرح شرم میں ڈوبے گھبرا رہے تھے۔"

پھر تیسری لڑکی نے میگزین میں شائع شدہ ایک تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"اس تصویر کے متعلق، ہم آپ کی قیمتی رائے جاننے کے متمنی ہیں۔"

میری تمام بولڈنیس ہیر ہوا ہو گئی۔ تصویر کی جانب دیکھنے سے قبل میرے ذہن میں پھر ایک خیال لہرایا۔

"ضرور کسی اشتہاری مجرم کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہوگی اور کون جانے اس پر انعام بھی ہو اور یہ لڑکیاں مجھے مجرم سمجھ کر اپنی گرفت میں لینے پر تلی ہوں۔

لیکن میں مجرم نہیں تھا اور اس بات کو ثابت بھی کر سکتا تھا۔ اس لئے شکل ملنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے ساری ہمت یکجا کی اور اس تصویر پر نظریں گڑا دیں۔ تصویر دیکھتے ہی میری سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی، کیونکہ وہ تصویر سو فیصد میری اور صرف میری تھی۔ میرے چہرے پر بکھرتے رنگ کو دیکھتے ہوئے پہلی لڑکی نے کہا۔

"آخر آپ بھی چھپے رستم نکلے۔"

پھر دوسری لڑکی نے بڑی تیکھی نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے پہلی لڑکی سے کہا۔

"اب میں تمہارے پہلے خیال کی تائید کر سکتی ہوں کہ آنجناب شریف

آدمی ہیں کیونکہ ایک افسانہ نگار کم از کم لطیف جذبات واحساسات کا مالک ہوتا ہے اور ایسے جذبے والے لوگ چور اچکے تو ہرگز نہیں ہو سکتے۔"

پہلی بار میں نے اطمینان کی سانس لی اور سارا خطرہ ٹلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے فاتحانہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔ تیسری لڑکی نے بڑے اخلاق سے کہا۔

"ہاں جناب اب آپ بالکل اطمینان سے ہم لوگوں کے پاس بیٹھ سکتے ہیں۔ آپ کی کہانی کے ساتھ آپ کی تصویر ہی نہیں، دفتر کا پورا پتہ بھی درج ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ ایک اونچے عہدے پر فائز ہیں اور ہم سب آپ کے اس طرح مل جانے کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتے ہیں۔"

میں نے بھی مسکراتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

"مجھے بھی اس سرد رات میں آپ سب سے مل کر اور غیر متوقع طور پر یہاں پناہ پا کر بے حد خوشی ہوئی۔"

اب میری آواز میں مکمل خود اعتمادی لوٹ آئی تھی اور میں نے ان کے چہروں پر اپنی شخصیت کا رعب پڑتے ہوئے محسوس کر لیا تھا۔

"مگر جناب نے اپنا سوٹ کیس اور کمبل وہاں کیوں چھوڑ رکھا ہے۔" پہلی نے کہا۔

میں اپنا سامان بھی وہیں لے آیا۔ اور ابھی بیٹھا بھی نہ تھا کہ دوسری لڑکی نے کہا۔

"سوٹ کیس کافی قیمتی، مضبوط اور خوبصورت ہے۔ یہ سسرالی مال ہے کیا؟"

میں نے ان تینوں کے قہقہوں کے درمیان کہا۔

"جی نہیں ـــ یہ سسرالی نہیں ہے کیونکہ سسرال کا ابھی تک پتہ نہیں۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ سسرال کا پتہ دریافت کرتے ہوئے آپ ہمارے گھروں تک آجائیں؟" یہ تیسری لڑکی تھی۔ میں نے بھی نہلے پر دہلا مارا۔

"جی نہیں۔ فی الحال تو ایسا ارادہ نہیں ہے اور اگر ہوا بھی تو آپ تینوں کے بجائے صرف ایک ہی کے در تک پہنچوں گا۔" میں نے صرف ایک پر زور ڈالتے ہوئے تیسری لڑکی کو میٹھی نگاہوں سے دیکھا تھا اس لئے وہ کافی شرمندہ ہوئی۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور ان لوگوں سے دریافت کیا۔

"آپ لوگوں کو اب میرے مزید تعارف کی ضرورت نہیں ہے مگر میں چاہوں گا کہ۔۔۔۔۔"

"کہیں انگلی پکڑ کر کلائی پکڑنے کا ارادہ تو نہیں؟" پہلی لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا پھر تیسری لڑکی بڑے مہذب انداز سے تعارف کرانے لگی۔

"میں ناہید اختر ہوں۔ یہ بلونت کور ہے اور یہ ــــ" اس نے پہلی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ لتا ہے اور ہم تینوں کلاس فرینڈز بھی ہیں۔"

"واقعی خوشی ہوئی۔ مگر یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ آپ کے نام مشہور گلوکاراؤں سے ملتے ہیں۔"

"اب تک ہم لوگوں کی سریلی آوازوں سے آپ نے یہ اندازہ نہیں لگایا تھا۔" لتا نے شوخی سے کہا اور میں لاجواب ہو گیا۔

اس طرح کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ابھی صرف بارہ بجے تھے مجھے اپنی ٹرین کے لئے مزید تین گھنٹہ انتظار کی سولی پر لٹکنا تھا۔

"ویسے بائی دے وے آپ کہاں جا رہے ہیں؟" ناہید نے دریافت کیا۔

"میں علی گڈھ جا رہا ہوں۔"

"آسام میل سے ___؟"

"جی ہاں ___"

"ارے واہ۔ ہم سب بھی اسی ٹرین کے مسافر ہیں جناب!" بلونت کور بولی۔

"مگر آپ تو پورنیہ میں رہتے ہیں نا؟"

"جی ہاں ۔آج ہی پٹنہ آیا ہوں۔ علی گڈھ میں میری چھوٹی بہن پڑھتی ہے۔اس کی فیس ادا کرنی ہے۔ ضرورت کی بہت ساری چیزیں خرید کر دینی ہے۔ اور دو چار روز بعد سردیوں کی چھٹی ہو رہی ہے اس لئے اسے ساتھ ہی لے آنے کا ارادہ ہے۔" میں نے پوری تفصیل بتاتے ہوئے دریافت کیا۔

"اور آپ ___؟"

"ہم لوگ دہلی تک جائیں گے۔بقیہ باتیں تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے!" پھر لتا میرے سوٹ کیس پر انگلیوں سے طبلہ بجاتی ہوئی بولی۔

"کیوں نہ تاش کی بازی لگائی جائے۔اس طویل انتظار کو جھیلنا بہت مشکل ہے۔"

سب نے اس کی تائید کی اور مجھے بھی شامل ہونا پڑا۔ میرے سوٹ کیس پر ہی تاش کے پتّے بانٹے گئے۔ ناہید میری پارٹنر تھی اور لتا و بلونت ایک ساتھ تھیں۔ وہ لوگ کافی تیز تھیں مگر میں بھی اس میدان میں اناڑی نہیں تھا۔ پہلے کی دونوں بازی میں نے ہی جیتی اور جب تیسری بازی بھی میرے ہاتھ رہی تو لتا نے کہا۔

"یار ناہید، تمہیں پارٹنر بہت تیز ملا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ادھار نہ دو گی۔"

اس نے کچھ اتنے معصوم ڈھنگ سے یہ بات کہی کہ سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ناہید نے بھی چھیڑا۔

پارٹنر ادھار دینے کی چیز نہیں ہے ڈیر۔ کچھ خرچ ورچ کرو تو۔۔۔۔"

"ارے ہاں ۔۔۔" لتا کچھ یاد کرتی ہوئی بولی۔

"بتو۔۔ ذرا تھرمس تو لاؤ۔ اب کافی کے ساتھ بھی انصاف کیا جائے۔"

کافی کا نام سنتے ہی میرے جسم میں حرارت سی دوڑ گئی۔ اس سرد رات میں واقعی گرم کافی کی شدید ضرورت تھی۔ ہم چاروں نے کافی پی اور کافی کے بعد مجھے سگریٹ کی خواہش ستانے لگی۔ مگر ان لڑکیوں کی موجودگی میں سگریٹ پینا درست نہیں تھا لیکن اپنی خواہش پر قابو پانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس لئے میں نے ہمت کر کے لتا سے کہا۔

"اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں سگریٹ پی لوں۔"

"ضرور۔۔۔" اس نے بات جاری رکھی۔

"مگر اکیلے نہیں۔ ہم بھی آپ کا ساتھ دیں گے اور چونکہ آپ ہمارے مہمان ہیں اس لئے یہ فرض بھی ہمارا ہی ہے۔"

پھر اس نے بیگ سے ۵۵۵ کا پیکٹ نکالا تو میں حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ لڑکیاں اتنے قیمتی سگریٹ سے شوق فرماتی ہیں۔ لتا نے شاید میری حیرت کو پڑھ لیا تھا اس لئے بولی۔

"سب چلتا ہے یار۔۔۔ یہ زندگی ایک ایڈونچر ہے۔ اب لڑکیاں ہر میدان میں لڑکوں کے شانہ بہ شانہ چل رہی ہیں تو سگریٹ نوشی سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

پھر اس نے ایک سگریٹ میری طرف بڑھا دی۔ میں نے شکریئے

کے ساتھ قبول کیا۔ اس سے قبل کہ میں اپنا لائٹر روشن کرتا۔ ناہید نے اپنا گیس لائٹر روشن کر دیا۔ "تھینکس" کہہ کر میں نے سگریٹ سلگائی، اور ایک لمبا کش اپنے اندر اتار لیا۔ سگریٹ کا دھواں اندر جاتے ہی ایک لطیف سرور کا احساس ہوا۔ میں نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی اس سگریٹ نے ایک نرالا سرور بخشا ہے۔"

"سرور" سگریٹ میں نہیں جناب، میرے ہاتھوں کے لمس میں تھا جسے آپ نے سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ اپنے اندر اتار لیا ہے۔ لتا کے کہتے ہی تینوں نے قہقہہ بلند کیا اور میں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

شروع سے اب تک حالات کچھ اس طرح ڈرامائی انداز سے پیش آرہے تھے کہ نہ کچھ سوچنے کا موقع ملا تھا اور نہ ہی رائے قائم کرنے کا۔ مجھے اس سرد رات میں پناہ کی تلاش تھی اور میں یہاں نہ صرف پناہ گزیں تھا بلکہ بہت ہی رومان پرور ماحول میں اس گلابی جاڑے کی رات کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اس لئے خواہ مخواہ کچھ سوچ کر ذہن کو کیوں پراگندہ کیا جاتا ــــ؟

ان لڑکیوں کا انداز بہت ہی آزادانہ اور بے باکانہ تھا اور یہ ان کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ دہلی میں پڑھنے والی لڑکیوں سے اس بے باکی کی امید بھی کی جاسکتی تھی۔ کم از کم اتنا تو تھا کہ یہ اپنی حفاظت آپ کرسکتی تھیں۔

بہر حال رات کے تین بجے تک وقت گذارنا تھا اس لئے گفتگو اور تاش کے کھیل کا سہارا لینا بھی ضروری تھا۔ تاش کی بازی پھر جمی مگر اس بار ناہید کی جگہ لتا نے لے لی تھی اور بہت ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی ہوئی

ہر بات میں یار، یار، کرتی جا رہی تھی۔ میں بھی اس کی اس بے تکلفی سے اندر ہی اندر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گیم کے دوران ہی لتا کے دیئے ہوئے سگریٹ بھی پھونکتا جا رہا تھا۔ اس سرد رات میں سگریٹ کا مزہ واقعی دوبالا ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ بجتے بجتے نیند سے میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ میں کافی کوشش کر رہا تھا کہ پلکیں بوجھل نہ ہوں مگر نیند پر کس کا بس چلا ہے؟ بار بار منہ دھونے سے بھی فائدہ نہیں ہوا۔ اور اس غنودگی میں کتنی ہی غلط چالیں بھی چل دیں۔ میں دو بازیاں ہار گیا تو لتا نے اپنی نشیلی آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"کیوں یار۔ کیا واقعی تم نے سگریٹ کے ساتھ میرے لمس کو بھی اندر اتار لیا ہے کہ تمہاری پلکیں نشہ سے یوں بوجھل ہوتی جا رہی ھیں"۔ ناہید نے لتا کی اس بے تکلفی پر اسے ڈانٹا۔

"کیوں بے چارے کو اس طرح چاٹ رہی ہو۔ سب تمہاری طرح الو کی نسل سے تو نہیں ہیں جو رات بھر جاگتے رہیں۔"

ناہید کی بات پر لتا جھینپ گئی اور میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" واقعی نیند بہت پریشان کر رہی ہے۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹے باقی ہیں۔ ایک مختصر سی جھپکی تو لی ہی جا سکتی ہے۔"

میرے لمبی جمائی لینے پر بلونت بولی۔

" واہ بھئی واہ ـــــ اب تک تو یہ سنتے آئے تھے کہ مرد عورتوں کے محافظ ہوتے ہیں۔ اور آپ کی موجودگی میں ہم لوگ پرسکون بھی ہو گئے تھے۔ مگر ـــــ خیر آپ سو رہیں اب لڑکیاں آپ کی حفاظت کریں گی۔"

تینوں کا ملا جلا قہقہہ بلند ہوا۔ میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ نیند پر

قابو پانے کی کوشش میں سر اور بھی بوجھل ہو گیا تھا۔ اب میرے لئے پلکوں کو کھلی رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اسی جگہ آرام کرسی پر لڑھکتے ہوئے ان سے معذرت چاہی اور آنکھیں بند کریں۔

نیند کب آئی اس کا تو پتہ نہیں چل سکا۔ مگر جب آنکھ کھلی تو خوب جم کر سو لینے کا احساس ہوا۔ آنکھیں پوری طرح کھول کر دیکھا۔ کمرہ خالی تھا اور صبح کا اجالا پھیل گیا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ میرا سامان سلامت تھا اور سوٹ کیس پر کاغذ کا ایک پرزہ پڑا تھا۔ میں نے لپک کر اسے اٹھایا۔

لکھا تھا ــــــ "ہمیں سوئے ہوئے مرد بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس لئے ٹرین آنے پر بھی آپ کو بیدار کرنے کی گستاخی نہیں کی۔ اس سرد رات میں ہم نے آپ کو پناہ دی۔ اپنی رومانی کمپنی عطا کی۔ گرم اور لذیذ کافی پلائی اور اس کے ساتھ چرس بھرے سگریٹ سے آپ کو وہ سرور بخشا جس سے اب تک آپ ناآشنا تھے۔ اس کے عوض ہم نے آپ سے کچھ نہیں چاہا ــــ

صرف واپسی کا کرایہ چھوڑ کر آپ کی جیب خالی کر دی ہے۔ ہاں سوٹ کیس سے بھی قیمتی سامان اڑا لیا ہے۔ آپ کی گھڑی گرچہ بہت قیمتی اور حسین ہے پھر بھی اسے رہنے دیا تاکہ آپ کو وقت کا احساس ہوتا رہے۔

امید کہ گلابی جاڑے کی یہ رات آپ ہمارے نام منسوب کریں گے۔"

●●

کیل اندر اندر

کھٹ کھٹ..... کھٹ.....

لمبی لمبی کیلیں اس کے وجود کے اندر دھنستی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

کیلوں کے سہارے ایک بار پھر بڑے بڑے اور خوشنما بورڈ آویزاں کئے جا رہے تھے۔ ہر بورڈ پر ملک کے مستقبل کی خوشنما پینٹنگ تھی۔ آرٹسٹ نے رنگوں کے انتخاب میں بڑے سلیقے سے کام لیا تھا۔ ہر رنگ اپنی دہری معنویت کے ساتھ لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ ملک کا مستقبل اس پینٹنگ میں رنگوں کے سہارے ابھار کر سامنے لایا گیا تھا۔

"ماضی کی پینٹنگ کہاں ہے بھائی ...؟"

وہ آرٹسٹ سے سوال کرنا چاہتا تھا تبھی کسی نے اندر سے جھانک کر

باہر دیکھا اور اپنا لمبا ہاتھ بڑھا کر پوری پینٹنگ پر سیاہی پوت دی اور سارے نقوش دھندلکوں میں گم ہو گئے۔

"جواب مل گیا بھائی ۔۔؟"

وہ جواب سے واقف تھا پھر بھی اس پینٹنگ پر اپنی توجہ مرکوز کئے تھا جو سیاہیوں کے درمیان سے سر ابھار کر اپنے وجود کا اعلان کر رہی تھی۔

کھٹ ۔۔۔۔ کھٹ ۔۔۔۔ کھٹ ۔۔۔۔۔۔

ہر چوراہے پر بورڈ آویزاں کئے جا رہے تھے۔ ہر منظر ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ رنگوں کا کھیل ہر پینٹنگ میں مشترک تھا اور ہر جگہ ایک گائیڈ چیخ چیخ کر ان پینٹنگوں کی تشریح کر رہا تھا۔

کھٹ ۔۔۔۔ کھٹ ۔۔۔۔ کھٹ ۔۔۔۔۔

کیلوں پر پڑتی ہر ضرب کے ساتھ کیلیں اس کے اندر اترتی جا رہی تھیں۔ آوازوں کے خوشنما پرندے اس کے ذہن کے آسمان پر چکر لگا رہے تھے۔

"۔۔۔ آج سارا ملک بڑے بحرانی دور سے گذر رہا ہے۔ اگر آپ ملک کی خوشحالی چاہتے ہیں۔ اگر امن و امان کو پھیلتے ہوئے دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اگر آپ کو جمہوریت کی بقا مقصود ہے، اگر آپ زندگی کو خوشیوں سے ہمکنار دیکھنے کے خواہش مند ہیں تو آیئے ملک سے غریبی کو دھکیل کر باہر کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹایئے۔ ہمارے ہاتھ مضبوط کیجئے۔ آزادی سے آج تک ہم ہی آپ کے پاسبان رہے ہیں اور ۔۔۔ اور ۔۔۔۔"

یہ عجیب اتفاق تھا کہ اس کا جنم بھی اسی دن ہوا تھا جس دن آزادی نے

غلامی کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ والدین نے آزادی کی خوشی میں اس کا نام آزاد رکھ دیا تھا اور یوں تین دہائیوں سے وہ آزادی کے ساتھ ہی پروان چڑھتا رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے آزادی کی طرح اپنے وجود پر بھی شک ہونے لگتا۔

"میں ہوں بھی ——— یا صرف ہونے کا پوز مار رہا ہوں۔؟"

اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

ہر پانچ سال بعد چوراہوں پر خوشنما بورڈس آویزاں کئے جاتے اور اس میں ملک کے مستقبل کی جھلک خوشنما وعدوں کے ساتھ دکھائی جاتی اور ہر بار اس کے ذہن میں ایک ہی سوال اٹھتا۔

"ماضی کی پنٹنگ کہاں ہے بھائی —؟"

اور جب یہ سوال اس کے ذہن پر ٹھوکریں مارنے لگتا تو ماضی کا ایک ایک لمحہ ننگا ہو کر اس کے سامنے ناچنے لگتا۔ ہر لمحہ اس کے سوال کا جواب ہوتا تب وہ سوچنے لگتا۔

"مستقبل کہاں ہے؟"

ہر لمحہ اپنے ناخنوں سے مستقبل کے چہرے پر کھرونچ بناتا ہوا اسے ماضی کے دبیز کفن میں لپیٹتا جا رہا تھا۔ وہ متحیر سا چوراہے پر کھڑا اس پنٹنگ کو دیکھ رہا تھا جو مستقبل کی جھلک دکھا رہی تھی اور گذرتا ہوا لمحہ اس پر دھول ڈالتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

کھٹ ... کھٹ ... کھٹ ....

کیلیں ٹھونکی جا رہی تھیں اور ہر ضرب کے ساتھ کیل اس کے اندر دھنستی جا رہی تھی۔

اس بار ایک عجیب حادثہ ہوا تھا۔ پانچ سال کا عرصہ صرف تین سال میں ختم ہو گیا تھا۔ اس سے قبل بھی ایک عجیب سی انہونی بات ہو گئی تھی۔ راتوں رات طوفان کی زد میں آکر تقریباً سارے پرانے درخت جڑ سے اکھڑ گئے تھے۔ ان جگہوں سے نئی کونپلیں جھانکنے لگی تھیں۔ شاخوں سے نرم پتیاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ سب نے وقت سے قبل ہی بہار کو گلستاں کی زینت بننے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ اس طوفان کے بعد جو سکون نصیب ہوا تھا اس میں دوسرے طوفان کی آمد پوشیدہ تھی جس سے بہت ہی کم لوگ واقف تھے۔

شاخوں نے اپنی مرضی سے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کر دیئے۔ کونپلوں کی پرورش اپنی مرضی کے مطابق ہونے لگی۔ ایک درخت کی شاخ دوسرے درخت کی شاخوں سے الجھنے لگی اور پھر ساری شاخیں اس طرح ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگیں کہ ان کی شناخت ہی مشکل ہو گئی — اور شاخوں کے اس طرح الجھ پڑنے سے درخت کی جڑیں ہی متاثر ہو گئیں اور پھر نئی پتیاں زرد لباس پہن کر اپنے وجود پر ماتم کرنے لگیں اور خزاں نے بڑھ کر زبردستی لائی گئی۔ اس بہار کو اپنے زرد آنچل میں سمیٹ لیا۔

کھٹ..... کھٹ..... کھٹ.....

ہر چوراہے پر لوگ مستقبل کی پینٹنگ کیلوں کے سہارے لٹکائے عوام کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے تھے۔ اور ان کا گائیڈ چیخ چیخ کر پینٹنگ کی تشریح کر رہا تھا۔

”اس ملک کا مستقبل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ تم نے اگر ہمیں کامیابی

سے ہمکنار کیا تو ہم تمہاری تقدیر بدل دیں گے۔ تمہارے تحفظ کی ضمانت ہم لیتے ہیں۔ تمہاری زبان کو جائز مقام دینے کا وعدہ ہمارے منشور میں شامل ہے تمہارے اداروں کا اقلیتی کردار بحال کرنا ہمارا پہلا کام ہوگا تم... تم ...۔۔۔۔"

دوسرے چوراہے پر دوسرا گائیڈ بینٹنگ لئے چیخ رہا تھا۔

"تم سبز باغ دکھانے والوں کے فریب میں نہ آؤ۔ خوشنما رنگوں پر نہ جاؤ۔ عقل کے ناخن لو۔ تم گاؤں میں رہنے والے بھولے بھالے لوگ ہو تمہارے درد کو شہروں میں رہنے والی ہستیاں کیوں کر سمجھ سکتی ہیں ـــــ ہمارا ملک گاؤں اور کسانوں کا ملک ہے۔ کسان کا بیٹا ہی تمہارے مسائل سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ خوش رنگ جال سے باہر نکلو۔ تمہارے مسائل کا حل ہمارے پاس ہے۔ تمہارے ہر گھر سے کم از کم ایک فرد کو روزگار دینے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ تمہارے کردار، تمہاری زندگی، اور تمہارے اداروں کا تحفظ ہمارا پہلا قدم ہوگا۔ اور... اور..."

آوازوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تین دہائیوں سے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ وہ ان ساری آوازوں کو اپنے اندر جذب کرتا ہوا پروان چڑھا تھا۔ ہر کیل کی ضرب اس نے اپنی روح میں محسوس کی تھی۔ ہر بار مستقبل کی پینٹنگ دیکھ کر ماضی کی پینٹنگ دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں مچل مچل پڑتی تھی۔

سارے پینٹنگوں پر امن و سلامتی کے خوشنما کبوتر اڑتے ہوئے نظر آتے اور یہی خوشنما کبوتر گرہ یہ گدھ میں تبدیل ہو جاتے۔ رنگوں کی لالی سلگ اٹھتی۔ تصویروں کو زبان مل جاتی اور خاموشی چیخنے لگتی۔ لکیریں

مچلنے کو بے قرار رہتیں۔ شفق کی سرخی انگاروں میں بدل کر سارے ملک پر برس پڑتی۔ گلاب کی پنکھڑیاں نوکیلے کانٹوں میں تبدیل ہو کر شریانوں میں تیرنے لگتیں اور........

یہی تو آرٹسٹ کا کمال تھا۔ بلاشبہ اس کا فن عروج پر تھا جسے زوال کبھی نہیں تھا۔ گدھ اڑتے رہتے...... خاموشی چیختی رہتی.... لالی سلگتی رہتی..... لکیریں ناچتی رہتیں... اور چوراہے پر بورڈ آویزاں کئے جاتے رہتے...... یہ سلسلہ تین دہائیوں سے جاری تھا۔

کھٹ ... کھٹ ... کھٹ ....

ہر کیل اس کے اندر کافی گہرائی میں اترتی جا رہی تھی۔

اور اب بھی پھر وہی سماں تھا۔

کیلیں اس کے اندر اترتی جا رہی تھی۔

فیصلہ کی گھڑی لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔

گائیڈ کی چیخ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

کھٹ ... کھٹ ... کھٹ ...

ہم تمہیں سب کچھ دیں گے ....

کھٹ ... کھٹ ... کھٹ ......

ہم تمہارے ہیں، تمہارے لئے ہیں، تمہارے رہیں گے ...

کھٹ ... کھٹ ... کھٹ ...

ہم تمہارے ہیں، تم میں سے ہیں اور صرف تمہارے لئے ہیں ...

کھٹ ... کھٹ ... کھٹ ...

ہم تمہارے نہیں ہیں ... ہم تمہیں کچھ بھی نہیں دیں گے ...

یہ آواز نئی نہیں تھی ہاں کھردری ضرور تھی۔ آوازوں کے جنگل میں وہ اس آواز کو بھی دہائیوں سے سن رہا تھا اور اس پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں صرف ایک ہی رنگ کا استعمال ہوا تھا۔۔۔

ہم تمہیں کچھ نہیں دیں گے۔ تم ہم میں سے نہیں ہو۔ تم نے ملک سے غداری کر کے اس کے ٹکڑے کر کے اپنا حصہ لے لیا ہے۔ تمہارے مسئلوں کے لئے اکثریت کے مسئلے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ تمہاری زبان کو یہاں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمہارا کوئی بھی ادارہ اقلیتی کردار کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہم نہ تمہارا تحفظ چاہتے ہیں اور نہ ہی تمہاری زندگی کی ضمانت دے سکتے ہیں۔ تم اگر یہاں رہنا ہی چاہتے ہو تو آؤ ہمارے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ ہمارا رنگ قبول کر لو۔ ورنہ ... ورنہ ....

گائیڈ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، پینٹنگ کے نقوش کھردرے تھے۔ جو کچھ سامنے تھا۔ صرف ایک ہی رنگ پوری پینٹنگ سے عیاں تھا۔ وہاں کبوتر کی جگہ گدھ ہی دکھائے گئے تھے۔ شفق کی لالی کے عوض خون کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ گلاب کے پھول کی بجائے کیکٹس کے پودے اپنے وجود کا اعلان کر رہے تھے۔ اور ...

وہ تین دہائیوں سے اس پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔ آواز سن رہا تھا۔ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ نہ کوئی تبدیلی اور نہ ہی رنگ و روغن۔۔۔ وہی پرانا رنگ، وہی پرانے نعرے۔۔۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔۔۔

کھٹ ... کھٹ ... کھٹ ...

کیلیں اندر اترتی جا رہی تھیں۔ فیصلہ کی گھڑی ہر ضرب کے ساتھ قریب ہوتی جا رہی تھی۔

کھٹ... کھٹ... کھٹ....

ہم تمہیں سب کچھ دیں گے۔

کھٹ... کھٹ.... کھٹ.....

ہم تمہارے ہیں.. تمہارے تھے اور تمہارے رہیں گے۔

کھٹ... کھٹ... کھٹ....

ہم تم سے مختلف ہیں، ہم تمہیں کچھ بھی نہیں دیں گے۔

وہ چوراہوں سے گذرتا جارہا تھا۔ کیلیں اس میں پیوست ہوتی جارہی تھیں۔ فیصلہ کی گھڑی لمحہ لمحہ قریب ہوتی جارہی تھی۔ پورے ملک کے لئے مسیحا کا انتخاب کرنا تھا۔ سونمبر کی تاریخ کا تعین ہوچکا تھا اور وہ ابھی تک تین دہائیوں کے سارے برہنہ لمحوں کے درمیان کھڑا ہوا فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

کھٹ... کھٹ... کھٹ.....

کیلوں پر بڑی تیزی سے ضربیں پڑنے لگی تھیں۔

ہر ضرب کے ساتھ ماضی کا ہر لمحہ برہنہ ہو کر اس کے سامنے متحرک ہوتا جارہا تھا۔

ہر ضرب کے ساتھ اس کے ذہن کی تلخی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اور خیالات آپس میں گڈمڈ ہوتے جارہے تھے۔

ہر ضرب کے ساتھ خود فریبی کا خوشنما جال کمزور ہوتا جارہا تھا اور اسے شدت سے اپنی موجودگی کا احساس ہورہا تھا۔

ہر ضرب کے ساتھ حقیقت کا سورج ذہن کے اندھیرے میں شگاف پیدا کررہا تھا۔

کھٹ ... کھٹ ... کھٹ ...

فیصلہ کی گھڑی سوا نیزے پر آ گئی تھی۔

کھٹ ... کھٹ ... کھٹ ....

فیصلہ کن، وہ مخصوص لمحہ اس کے ہاتھوں میں تھرتھرا رہا تھا۔

کھٹ ... کھٹ ... کھٹ ....

آخری ساعت، تھرتھراتے ہوئے لمحہ میں فیصلہ کن کیل کی صورت کافی اندر تک اتر چکی تھی ـــ

وہ باہر نکلا۔ آوازوں کا جنگل بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ خاموشی کے پرندے چکراتے پھر رہے تھے۔ اس کا وجود کافی ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ ذہن کا سارا غبار دھل گیا تھا۔ نئے ارادوں نے اس کے وجود میں انگڑائیاں لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ پورے عزم اور حوصلہ کے ساتھ، حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے زمین میں اپنے قدموں کی دھمک اتارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

کھٹ .... کھٹ .... کھٹ ....

کیلیں اپنا وجود اس کے اندر گم کر چکی تھیں۔

"ہم تمہیں کچھ نہیں دیں گے ...." کی مدھم آواز اس کے کانوں میں بازگشت کی طرح دم توڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی ـــ!!

●●
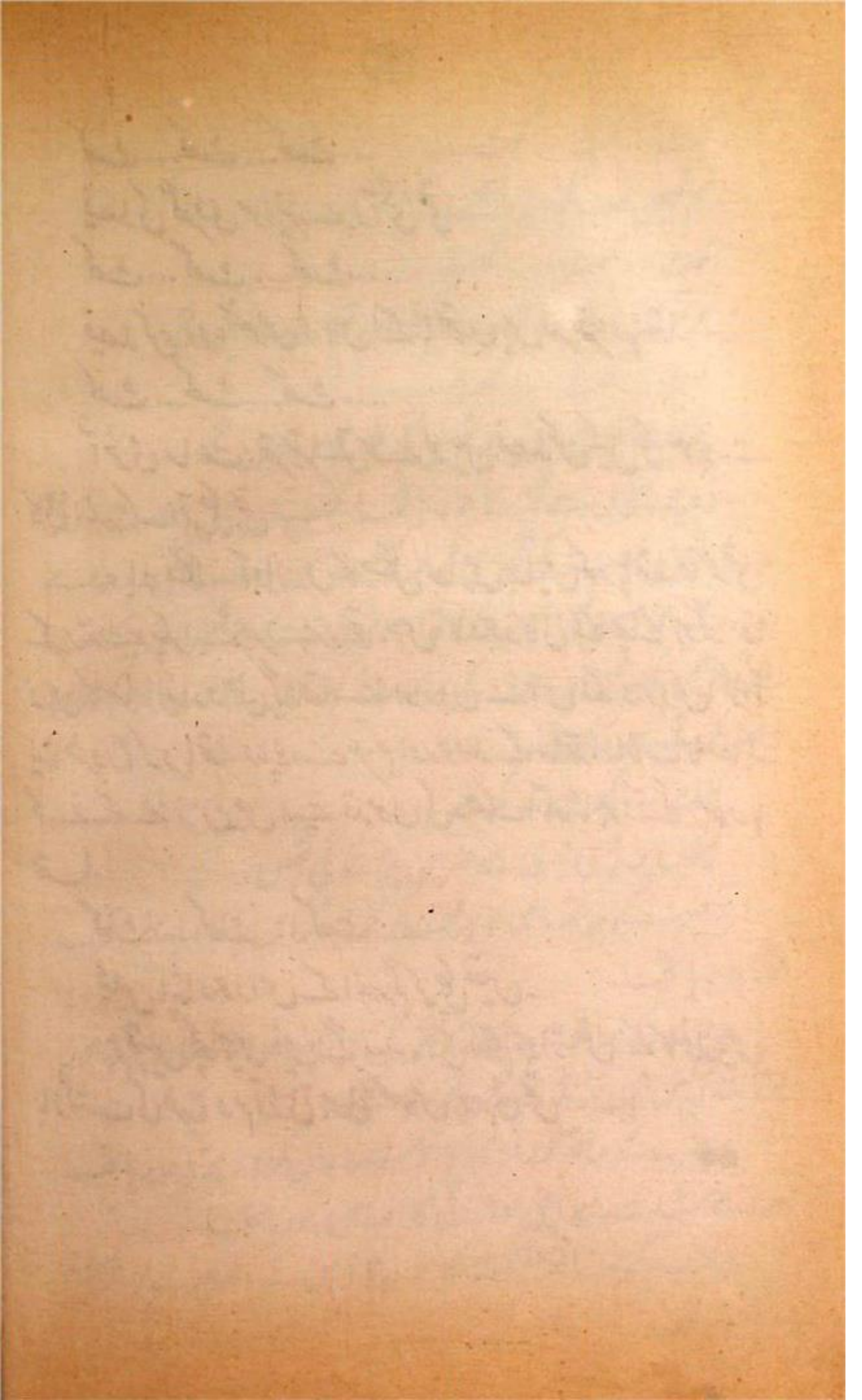
ٹوٹتے پتّوں کا دکھ

کھُلے آسمان کے نیچے تنہا پیڑ کھڑا ہے، اس نے نہ جانے کتنے موسموں کو جھیلا ہے۔ کبھی اس کی شاخیں ہری بھری ہو گئی ہیں، کبھی وہ پھولوں سے لدا خوشنما لگنے لگا ہے اور کبھی پتّوں نے اچانک ٹہنیوں سے رشتہ توڑ لیا ہے اور وہ ویران اُجڑا سا موسم کی اس بے رحمی پر غور کرتا ہوا سوچ رہا ہے کہ

زندگی بھی عجیب شے ہے — اور نہ جانے اس کے کتنے روپ ہیں — اس کے لاکھوں رنگ ہوں گے — ہر رنگ ایک دوسرے سے مختلف — ہر کا انداز جداگانہ —

مگر یہ بھی بہت بڑا سچ ہے کہ زندگی ہر روپ میں پیاری ہوتی ہے۔ میں بھی اس کی انیک رنگوں کو اپنی نگاہوں میں سجائے اپنی زندگی پر غور کر رہا ہوں۔

بچپن — جوانی — بڑھاپا — اور پھر زندگی کا خاتمہ — صرف اس تین دور میں یہ اتنے چولے بدلتی ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔

اور کبھی کبھی تو اسے پہچان بھی نہیں پاتا۔

میں نے بچپن سے ہی زندگی کو خود پر مہربان پایا۔ یہ اس کی مہربانی ہی تو تھی کہ زندگی میں آج تک کسی کمی کا احساس نہیں ہوا۔ ابا اپنے دور میں زمین دارانہ جاہ وجلال سے زندگی بسر کرتے رہے۔ جب تک سروس میں رہے ایک دبدبہ قائم رہا۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد وکالت شروع کر دی۔ وہاں دبدبے کا دوسرا دور شروع ہوا۔

میں جب بھی ان کی زندگی پر غور کرتا ہوں مجھے ایک حوصلہ ملتا ہے ایک عزم ملتا ہے اور ایک روشنی ملتی ہے۔ جو زندگی کی تاریک راہوں میں اجالا بھر دیتی ہے۔ ان کی شفقتیں ساتھ رہیں اور میں برسر روزگار بھی ہو گیا۔ اور تب یہ احساس ہوا کہ اب ابا کی عمر کام کرنے کی نہیں رہی۔ واقعی اب انہیں آرام کرنا چاہئے۔ زندگی کے ترسٹھ سال گذار لینے کے بعد بھی آدمی آرام نہ کرے تو کب کرے گا۔

ایک دن امی جان سے میں نے تذکرہ بھی کیا۔ وہ مسکراتی ہوئی بولیں۔ "مجھے تو یقین نہیں ہے کہ وہ مانیں گے پھر بھی تم کوشش کر کے دیکھ لو۔" میں نے دوسرے دن باتوں ہی باتوں میں ابا سے کہا۔

"ابا جان۔ آپ کی عمر اب کام کرنے کی نہیں ہے زندگی میں آپ نے اتنا کمایا ہے کہ اب کسی شے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اب ساری ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈال کر آپ آرام کریں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹے۔ مگر اتنے سالوں سے جو عادت ہو گئی ہے اس سے آسانی سے نجات نہیں مل سکتی۔ میں روزانہ کچہری جا کر صرف دل ہی تو بہلاتا ہوں۔ اس طرح زندہ ہونے کا احساس تازہ ہوتا رہتا ہے۔"

"وہ تو ہے لیکن آپ کے لئے آرام بھی تو ضروری ہے۔ یہاں شہر میں رہ کر آپ کو سکون نہیں مل سکتا یہ میں جانتا ہوں۔ میرے خیال سے آپ گاؤں چلے جائیں وہاں آپ کے پرانے احباب بھی ہوں گے۔ جانا پہچانا ماحول ہوگا اور دل بہلانے کے لئے وہاں کی کھلی ہوا میں آپ کے لئے بہت سے مشاغل ہوں گے۔"

یہ کہنے کے بعد میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ ابا بالکل کھو سے گئے۔ ایسا لگا کہ وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہوں۔ میں انھیں دیکھتا رہا اور وہ اپنی دنیا میں گم رہے۔ اس وقت انہیں ٹوکنا مناسب نہ سمجھ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

میں جانتا تھا کہ ابا ماضی کی رنگینیوں میں گم ہیں۔ میں اکثر ان کے ساتھ گاؤں گیا تھا اور ان دنوں کی یادیں آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ٹانڈہ اسٹیشن پر ہی گاؤں کے بیس پچیس احباب ان کے منتظر ہوتے۔ ان کا شاندار استقبال ہوتا اور پھر گرم جوشی کے درمیان تانگوں کے قافلہ میں تین میل کا سفر طے ہوتا۔

گاؤں پہنچتے ہی ملنے والوں کا تانتا بندھا ہوتا۔ سارے رعیت حاضری دیتے۔ سب کی فریادیں سنی جاتیں اور ان کی بھرپور امداد کی جاتی۔ کسی کی لڑکی کی شادی کا مسئلہ سامنے آتا کسی کے لڑکے کا۔ سارا معاملہ طے ہوتا۔ رات گئے سلسلہ چلتا رہتا۔ پھر ان کے خاص احباب رہ جاتے۔ حقہ کی گڑگڑاہٹ گونجتی رہتی اور رات گذر جاتی۔

ابا جاتے تو دو تین دنوں کے لئے مگر کبھی بھی ایک ہفتہ سے قبل واپس نہ ہو پاتے۔ سال میں دو تین دورہ تو گاؤں کا ضرور ہوتا۔ خاص

طور سے دسویں محرم کا دن وہیں گذرتا۔

ابّا واپس شہر آتے ساتھ میں گاؤں کی ڈھیر ساری یادیں ہوتیں جو ان کے لئے کسی بھی قیمتی سرمایہ سے کم نہ تھیں۔ اور آج بھی گاؤں کے تذکرے کے بعد ان ہی ساری یادوں کی پوٹلی کھُل گئی ، ہو گی اور ابّا ان بکھری یادوں میں گم زندگی کے حسین ترین روپ میں گم ہوں گے۔

دوسرے دن صبح ہی ابّا نے کہا۔

" میاں تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ میرے لئے گاؤں ہی ٹھیک رہے گا۔ وہاں کی آب و ہوا بھی اچھی ہے اس لئے میں سکون سے اپنی بقیہ زندگی گذار لوں گا۔"

پھر کیا تھا۔ ان کے جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے تمام پرانے احباب کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی اور واقعی کافی خوش نظر آنے لگے گویا کوئی انمول خزانہ ہاتھ آنے والا ہو۔

ادھر پانچ برسوں سے وہ گاؤں نہیں جا پائے تھے۔ ریٹائرمنٹ قریب تھا۔ بہت سارا کام، پھر اپنی جمع پونجی نکالنے کا سلسلہ ۔۔۔ پھر وکالت، ان سارے کاموں میں اتنا مصروف رہے کہ گاؤں جانے کا موقع ہی نہ نکال سکے۔ ہر دسویں محرم کے لئے اچھی خاصی رقم گھر کے پرانے نمک خوار سلامت میاں کو بھیجی جاتی رہی تاکہ وہ سلسلہ جو برسوں سے قائم تھا چلتا رہے ۔۔۔۔

میں خود ان کے ساتھ گاؤں تک جانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر انہوں نے فیض آباد اسٹیشن سے یہ کہہ کر واپس کر دیا۔

تمہارے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ لوگوں کو خط لکھ دیا ہے۔ وہ
اسٹیشن آئیں گے ہی اور یہاں بچے بھی تو اکیلے رہ جائیں گے۔"
میں نے ان کی بات مان لی کہ واقعی کوئی ایسی دشواری پیش
آئے گی ہی نہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر واپس آگیا اور سوچنے لگا کہ اتنے
عرصہ بعد جب انہوں نے گاؤں کی کھلی فضا میں سانس لی ہوگی تو زندگی
کا سارا حسن ان کے اندر اتر گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں خوش ہوتا رہا
کہ ان کی خوشی ہمارے لئے عزیز تھی۔
ان کے جانے کے بعد میں نے اپنی زندگی میں ایک خلاء سا
محسوس کیا۔ رفتہ رفتہ میں ان کی عدم موجودگی کا عادی ہوگیا اور میں نے بچوں
میں کھو کر ان کی کمی کے احساس سے چھٹکارہ پالیا۔
اسی طرح کئی ماہ گذر گئے۔ اس سال جب گرمی کا موسم
شروع ہوا۔ بچوں کو اسکول سے فرصت ملی تو سب گاؤں کے لئے مچل
گئے۔ آم کے پکنے کی خبر انہیں مل چکی تھی اور اب ان کے نزدیک
اس سے بڑھ کر اور کوئی پروگرام نہ تھا۔
" گاؤں میں آم کے باغات کی سیر کریں گے دادا ابا کے ساتھ
خوب گھومیں گے۔ خوب سیر کریں گے۔ آم، جامن کھائیں گے۔"
بیگم کا بھی یہی ارادہ تھا۔ میں نے کچھ دن کے لئے چھٹی لی، اور
بچوں کو لے کر گاؤں پہنچ گیا۔ میں نے اپنی آمد کی خبر کسی کو نہ دی تھی اس
لئے اسٹیشن پر کوئی آیا بھی نہ تھا۔ ہم لوگ جب گاؤں پہنچے تو شام کا
وقت تھا۔ تھکن کا جو بھی احساس تھا وہ گاؤں کی کھلی فضا میں سانس
لیتے ہی ختم ہوگیا۔

میں جب گاؤں کی پرانی حویلی میں داخل ہوا تو سب سے پہلے پرانے ملازم سلامت پر نظر پڑی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی "چھوٹے سرکار" کہتے ہوئے لپک پڑا۔ تانگہ سے سامان اتارا گیا۔ بیگم بچوں کے ساتھ حویلی کے اندر چلی گئیں اور میں دیوان خانے کے اندر گیا کہ ابا سے ملاقات کرلوں۔

دیوان خانے کے اندر مسہری پر ابا نیم دراز تھے۔ سامنے حقہ رکھا تھا۔ چلم کے سارے انگارے سرد پڑچکے تھے۔ پھر بھی کمرے میں لکھنوی قوام کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ابا سیدھے ہوگئے اور میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک پھیکی مسکراہٹ ان کے لبوں پر رینگ گئی۔

"کب آئے تم ـــ؟ بچے بھی ساتھ ہیں۔"

انہیں دیکھ کر میں حیرتوں میں ڈوب گیا۔ ان چند مہینوں میں ہی وہ برسوں کے بیمار لگ رہے تھے۔ ان کے چہرے سے تھکن نمایاں تھی۔ یسا محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی کے انگارے سرد پڑچکے ہوں صرف راکھ کے اندر چند چنگاروں باقی ہوں۔

"ابا۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ آپ اتنے کمزور کیسے ہوگئے؟ اپنی بیماری کی خبر بھی تو دی ہوتی۔ آپ نے اپنے کسی خط میں اس کا ذکر بھی تو نہ کیا۔"

"میں بیمار ہی کب تھا بیٹے ـ" وہ ٹھہرے ہوئے الفاظ میں بولے۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کمزور بھی نہیں ہوا ہوں۔ ممکن ہے ماحول کی تبدیلی نے اپنا رنگ چھوڑا ہو۔

وہ خاموش ہوگئے لیکن ان کی خاموشی چیخنے لگی۔ امی درمیان

اندر سے نیچے آگئے۔ ذیشو نے ان کی آنکھیں بند کر لیں بشتو ان کے گلے میں جھول گیا اور شانو میاں نے جلدی سے گود میں بیٹھ کر اپنی جگہ محفوظ کر لی۔ ان کے لبوں پر ایک جاندار مسکراہٹ ابھری ـــــ زندگی سے بھرپور۔ اور پھر وہ بچوں میں گم ہو گئے۔

میں نے حویلی کے ماحول میں بھی تبدیلی محسوس کی تھی۔ وہ چہل پہل رخصت ہو چکی تھی جو یہاں کا حصہ ہوا کرتی تھی۔ اس رات میری آنکھیں کھلی رہیں اور میں ماضی میں گم رہا ـــــ

دوسرے دن بچے اپنے دادا کو لے کر آم کے باغات کی طرف چلے گئے ابا کافی خوش دکھائی پڑ رہے تھے، اور بچے انہیں اپنے ساتھ دوڑا رہے تھے۔ جب میں تنہا رہ گیا تو اس تبدیلی کا سبب اماں سے دریافت کیا انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بتایا۔

یہ سچ ہے بیٹے کہ وہ اس درمیان بیمار نہیں ہوئے اور نہ ہی ان کی غذا میں کمی ہوئی۔ یہاں زندگی کی ساری آسائشیں مہیّا ہیں۔"

"پھر ـــــ؟" میں مجسم سوال بن گیا۔

"دراصل جو کچھ سوچ کر وہ یہاں آئے تھے اور گاؤں کا جو پانچ سال پرانا تصور ان کے ذہن میں تھا انہوں نے سب کچھ اس کے بالکل برعکس پایا۔

وہ خاموش ہو گئیں اور ایک لمبی سانس لیتی ہوئی بولیں۔

"ٹانڈہ اسٹیشن پر اترتے ہی ان کی نگاہیں اس گاؤں کے پرانے احباب کو تلاش کرتی رہیں مگر ایک بھی شخص گاؤں سے نہیں آیا تھا۔ ان کا آدھا ولولہ تو وہیں سرد ہو گیا اور جب گاؤں پہنچے تو یہاں بھی لوگوں میں وہ پہلی جیسی گرم جوشی موجود نہیں تھی۔" یہ کہہ کر اتی اداس ہو گئیں اور پھر خلا میں گھورتی ہوئی بولیں۔

"انسان اپنے ماضی سے بہت زیادہ اٹیچڈ رہتا ہے بیٹے اور تمہارے ابا تو کچھ زیادہ ہی ہیں۔ وہ ماضی کا خزانہ لینے یہاں آئے تھے مگر حال بالکل بدلا ہوا ملا۔ ماضی کا ایک بھی عکس باقی نہیں بچا تھا۔ اس قلیل عرصے میں کتنے انقلاب آئے، زمین داری ختم ہوئی۔ باغات بک گئے، زمینیں بکیں اور پرانے لوگ بھی وقت کے ساتھ اپنے خول میں سمٹ گئے۔"

وہ رکیں پھر میری طرف دیکھتی ہوئی کہنے لگیں۔

"تمہارے ابا اس اچانک تبدیلی کے لئے ذہنی طور سے تیار نہ تھے اس لئے جھیل نہیں پائے۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ کر بکھرتے رہے۔ وہ لوگ جو دیکھتے ہی سلام کرنے حاضر ہوتے تھے اب دیکھ کر انجان بنے گذر جاتے ہیں۔ ان ساری تبدیلیوں نے زندگی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اسی انقلاب نے انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے۔"

اماں خاموش ہوگئیں اور میں سوچ و فکر کے دَلدَل میں دھنستا چلا گیا۔ پھر اماں کی آواز ابھری۔

"اب تو کہیں آتے جاتے نہیں۔ دیوان خانے کے اندر یا پھر سہ پہر میں پھلواری میں تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔ کبھی کبھار مجھے بلا لیتے ہیں۔ پھر سلامت میاں سے گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہی ایک غم گسار رہ گئے ہیں۔"

یہ سب سن کر میں بھی کھو گیا۔ سوچنے لگا ـــــ زندگی تو اسی طرح پل پل رنگ بدلتی ہے نہ تو اسے اپنی مٹھی میں قید کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بھاگتے ہوئے وقت کو روکا جا سکتا ہے۔ ابا جس زندگی کی تمنا میں یہاں آئے تھے وہ تو انقلاب کی نذر ہو گئی تھی۔ انہیں صرف پرچھائیں ملی اور وہ اسے

قبول نہ کر سکے اس لئے لوٹ گئے۔

میری چھٹی ختم ہو رہی تھی میں واپس ہونا چاہ رہا تھا مگر اّبا نے روک لیا۔

رُک جاؤ بیٹے۔ دو چار دن اور ٹھہر جاؤ۔ دسویں محرم قریب ہے اس کے بعد چلے جانا۔

دسویں محرم کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں بہتیرے رنگ بکھر گئے۔ میں نے یہاں کی محرم کی دھوم دھام دیکھی تھی۔ خوب شاندار انتظام ہوتا تھا۔ دادا ابا کے زمانے میں بھی ایک بار یہ دھوم دھڑکّا دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس دن حویلی میں خوب چہل پہل ہوتی۔ شربت تقسیم کیا جاتا' پورے گاؤں کی شاندار طریقے سے ضیافت کی جاتی۔ ہزاروں خرچ کئے جاتے اور ہزاروں خیرات کئے جاتے۔ اور ایک عرصہ تک اس دعوت کے تذکرے ہوا کرتے۔

یہ سلسلہ ایک زمانے سے چلتا آرہا تھا۔ دادا اور ان کے دادا اور ان کے دادا —— نہ جانے کب سے یہ سلسلہ اسی آن بان سے قائم تھا اور ابا نے بھی اس میں کوئی کمی نہ ہونے دی تھی۔

دادا ابا کے زمانے میں کسی شئے کی کمی تو تھی نہیں۔ سب کچھ گھر کا ہوتا تھا۔ نفیس چاول، شاندار خصّی، تیل، گھی سب گھر کا ہوتا۔ مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا۔

جوں جوں دسویں محرم قریب آرہا تھا ابا کے چہرے کا رنگ فق ہوتا جارہا تھا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو انہوں نے ایک لمبی آہ بھری اور گویا ہوئے۔

”تم سے کیا چھپاؤں بیٹے۔ دسویں محرم کی روایت کو قائم رکھنا ضروری ہے۔

اور اس کے اہتمام میں فرق بھی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ باپ دادا کے وقار کا سوال ہے۔ ان کے بھرم کو قائم رکھنے کے لئے وہی سب انتظام کرنا ہوگا جو ایک زمانے سے ہوتا آیا ہے۔ اور پھر پانچ سال بعد میں خود اس میں شرکت کر رہا ہوں اس لئے کسی شئے کی کمی نہیں ہونی چاہئے۔" وہ چپ ہو گئے، پھر ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بولے۔

"انتظام کے نام پر اب تک کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ روپیہ کہاں سے آئے یہی سوچ کر فکر مند ہو رہا ہوں۔ میری جمع پونجی شہر میں زمین خریدنے مکان بنوانے اور دیگر کاموں میں خرچ ہو گئی ہے۔ گھر کی حالت بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر میں اپنے وقار کو مجروح بھی نہیں کر سکتا۔ اسی ادھیڑ بن میں مبتلا ہوں اور وقت کا سورج سوا نیزے پر آپہنچا ہے۔"

ابھی ہم گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ہمارا ایک پڑوسی سلطان آپہنچا۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ آتے ہی ادب سے ابا کو سلام کیا اور نگاہیں نیچی کرتے ہوئے بولا۔

"سرکار ـــ دسویں محرم قریب ہے ظاہر ہے اس بار بہ نفسِ نفیس آپ اس موقع پر تشریف فرما ہیں اور انتظام میں مصروف ابا مرحوم آپ کے دوستوں میں تھے اس لئے مجھ پر بھی کچھ فرض عائد ہوتا ہے اس لئے اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بھی اس کارِ خیر میں ہاتھ بٹاؤں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور روپے کی گڈی نکالتے ہوئے بولا۔

"میری طرف سے اگر یہ تین ہزار کی رقم قبول کریں تو مجھے مسرت ہوگی۔

اس کے خاموش ہوتے ہی ابا نے کہا۔

"بیٹے میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ رقم کا انتظام تو کب کا ہو چکا ہے عزیزم۔ اس کے لئے تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ان کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی مگر اس کے اندر درد کا جو ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا اسے صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

"ابا۔۔۔ ابھی تو آپ کو رقم کی ضرورت تھی۔ آپ اس سے قرض مانگنے بھی نہیں گئے تھے۔ وہ تو خود ہی پیش کر رہا تھا۔ آپ کو رکھ لینا چاہیئے تھا بعد میں واپس کر دیتے۔"

"تم اسے نہیں سمجھو گے بیٹے۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "میں تو بس باپ دادا کی عزت ڈھو رہا ہوں پتہ نہیں تم اسے کب تک نباہ پاؤ گے۔ تم کہتے ہو مجھے اس سے رقم لے لینی چاہیئے۔ جبکہ۔۔۔۔" وہ چپ ہو گئے اور ماضی میں جھانکتے ہوئے بولے۔

ایک بار جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اس زمانے کا واقعہ ہے۔ میں صبح سویرے گھوڑے پر سوار سیر کو نکلا تھا۔ راستہ میں اسی سلطان کے باپ نے روکا اور اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے پانچ سو روپے قرض مانگا اور مجھ سے کہنے لگا۔

اگر آپ کی عنایت ہو تو میں گھر آکر آپ سے یہ رقم حاصل کر لوں۔ آپ کی مہربانی سے بہت بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" میں نے اس سے کہا تھا۔ رقم تو تم ابھی مجھ سے لے سکتے ہو۔ پھر میں نے اسے رقم دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ گھر آنے کی ضرورت نہیں اور اس کی خبر ابا کو نہ ہونے پائے۔"

اس زمانے میں پانچ سو کی رقم کی بہت اہمیت ہوا کرتی تھی۔ یوں سمجھو کہ آج بیس پچیس ہزار ہوں گے۔ اور اتنی رقم کوئی جیب میں لے کر نہیں چلتا تھا اور میں راہ چلتے اتنی رقم سے کسی کی مدد کر سکتا تھا۔

وہ ماضی میں گم تھے بہر حال کے ریگستان پر اترتے ہوئے بولے۔

"اب بتاؤ بیٹے۔ میں نے جس کی مدد بارہا کی تھی آج اس کے بیٹے سے رقم قبول کر لیتا۔ ایسا کرنے سے نہ صرف خاندانی وقار مجروح ہوتا بلکہ میرے بزرگوں کی روحیں اپنے قبروں میں بے چین ہو جاتیں۔" وہ آنکھیں ملاتے ہوئے بولے۔

"بیٹا میں جس خاندانی وراثت کو ڈھو رہا ہوں تم اس کے درد کو شاید ہی سمجھ سکو۔ کبھی کبھی تو یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے کہ کہیں اس وراثت کا میں آخری امین تو نہیں؟"

وہ خاموش ہو گئے اور میں سوچتا رہ گیا۔

ابا جس طرح ماضی سے گہری وابستگی رکھتے تھے وہ وابستگی میرے ساتھ نہ تھی۔ اس لئے میرا ذہن ان باتوں کو جوں کا توں قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ پھر بھی یہ سب مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ خاندانی بھرم کے اس زندہ لاش کو آخر کوئی کب تک اپنے ناتواں کندھوں پر ڈھو سکتا ہے۔

اس دعوت کا انتظام روایتی طریقے سے ہی ہوا۔ سارے روپے کا انتظام گھر کے پرانے ملازم سلامت میاں نے کیا تھا جس کے عوض کھیت کا ایک حصہ انہیں دے دیا گیا تھا۔

اس زمانے کو ایک عرصہ گذر چکا ہے۔ میں نے ابا کی جگہ سنبھال لی ہے مگر میں نے خاندانی بھرم کو اپنی وراثت میں لینا قبول نہیں کیا ہے۔ آج اپنے گاؤں سے ہزاروں میل دور گیا کی اس کوٹھری میں پڑا سوچ

رہا ہوں۔

مجھ سے کوئی یہ کیوں نہیں کہتا کہ اب آپ آرام کریں اور ـــــ نہیں شاید نہیں ـــــ کوئی آکر اب یہ نہیں کہے گا۔ اب تو اپنی صلیب اپنے کندھوں پر ہی ڈھونی ہوگی۔ اور اب اسی روایت کو زندہ رکھنا ہوگا ـــــ

ماضی کی یادوں میں گم، میں یہ سوچ رہا ہوں ـــــ

زندگی کے کتنے روپ ہیں ـــــ

یہ کس کس رنگ میں ظاہر ہوتی ہے ـــــ

اور اس کا اصل روپ کون سا ہے ـــ !!

●●

گلاب بابو

ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔ جب بھی کسی اسکوٹر کی آواز سنتا ہوں
بس یہی گمان ہوتا ہے کہ گلاب بابو آگئے۔ مگر ہر بار مایوسی ہوتی ہے۔
میں جانتا ہوں کہ اب وہ نہیں آئیں گے مگر میرا دل اسے ماننے کو تیار
نہیں ہے۔ مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں آئیں گے، اور
آتے ہی کہیں گے۔

"سر۔ ذرا سی دیر ہو گئی۔ راستے میں اسکوٹر بگڑ گیا تھا"

میرے ہونٹوں پر آپ ہی آپ ایک مسکراہٹ آجاتی ہے۔ ایک
بے جان سی مسکراہٹ۔ گلاب بابو کا بہانہ بھی خوب ہوتا ہے۔ ان کے چہرے
پر ایسا بھولا پن ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ ان کے بہانہ کو مان لینے کو جی چاہتا
ہے۔

پہلے گلاب بابو ہمیشہ بس سے آیا کرتے تھے۔ ان کا گاؤں، گورا، پورنیہ سے ۲۵ کیلومیٹر دور ہے۔ انہیں ۹ بجے ہی گاؤں کے بس اسٹینڈ پر پہنچنا ہوتا تھا اور وہ بس، ہمیشہ ہی دیر سے پورنیہ آتی تھی۔

دراصل آفس، کچہری اور دیگر ضروری کاموں کے لئے لوگ اسی بس کو پکڑتے تھے کیونکہ اس کے بعد دو گھنٹہ تک کوئی بس نہیں آتی تھی۔ اس بس میں کافی بھیڑ ہوتی تھی، اندر باہر بلکہ چاروں طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے اور وہ بس قدم قدم پر رکتی دو گھنٹہ میں ۲۵ کیلومیٹر کی دوری طے کرتی ہوئی پورنیہ پہنچتی۔

گلاب بابو بس سے اترتے اور کافی تیز قدم بڑھاتے ہوئے دفتر آئے اور حاضری بہی پر اپنا دستخط کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ جاتے دیگر اسٹاف کے لوگ انہیں دیکھتے اور پریشان کرنے کے لئے کہتے۔

"صاحب آپ کو تین بار پوچھ چکے ہیں۔ لگتا ہے آج ان کا موڈ بہت خراب ہے۔"

یہ سنتے ہی گلاب بابو جھٹ اپنی کرسی سے اٹھتے اور میرے چیمبر میں داخل ہو کر آداب کرتے اور سامنے کھڑے ہو جاتے۔ میں انہیں دیکھنے لگتا وہ میرے پوچھے بغیر ہی کہنا شروع کرتے۔

"سر۔ بس ہی دیر سے آئی۔ میں تو ۹ بجے ہی گھر سے نکلا تھا" پھر دیر سے آنے کی وجہ بتاتے۔

"آج پھر بس نے ایر (ہنسہ) لے لیا تھا۔"

یہ ان کا روزانہ کا بہانہ ہوتا تھا۔ ممکن ہے سچ بھی یہی ہوتا ہو۔ وہ اپنی بات جھٹ پٹ کہہ دیتے اور فوراً ہی باہر نکل کر اطمینان کی سانس لیتے۔

پورنیہ سے قبل وہ مدھے پورہ آفس میں تھے۔ جب ان کا تبادلہ پورنیہ ہوا میں نہیں جانتا تھا کہ یہ گلاب چندر یادو کیسے ہوں گے۔ ایک بار پورنیہ بس اسٹینڈ پر کپور بک اسٹال سے کوئی رسالہ خرید رہا تھا کہ ایک صاحب سامنے آئے اور پرنام کیا۔ میں نے دیکھا ۳۵، ۴۰ سال کے درمیان ایک تنومند آدمی بھولا بھالا سا کھڑا ہے۔ اپنی طرف مجھے دیکھتے ہوئے پاکر انہوں نے کہا۔

"سر۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں ؟" پھر خود ہی بولے۔

"میں آپ کا اسٹاف ہوں۔" میں چونکا تب انہوں نے وضاحت کی۔

"میں گلاب چندر یادو ہوں۔ میرا ہی تبادلہ پورنیہ ہوا ہے۔ دو چار دن میں جوائن کر لوں گا۔"

میرے پوچھنے کے لئے کچھ رہا ہی نہیں تھا۔

گلاب بابو سواگتنگ کے پوسٹ پر تھے جسے عرف عام میں بڑا بابو کہا جاتا ہے۔ ان کا کام سارے اخباروں کا مطالعہ کرنا، ضلع سے متعلق خبروں کی کٹنگ کر کے میرے سامنے پیش کرنا اور پھر بعد میں متعلقہ محکمہ سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کرنا ہوتا تھا۔ محکمہ کا جو انفارمیشن سینٹر تھا اس کے انچارج بھی وہی تھے۔ کام کوئی زیادہ نہیں ہوتا تھا مگر پھر بھی کوئی کام وقت پر نہ کرتے۔ ½ ۱۱ بجے کے بعد آتے اور ½ ۳ بجے ہی نکل بھاگتے کہ بس چھوٹ گئی تو دقت ہو گی۔

کام وقت پر نہ کرنے کے لئے میں اکثر ان کی ملامت کرتا اور اس دن وہ پاگل ہو جاتے اور دن بھر ان کا دماغ ٹھیک نہیں رہتا۔ جو ملتا اس سے کہتے۔

"آج صاحب نے خواہ مخواہ مجھے ڈانٹ دیا۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے

تھا۔

دراصل وہ گھر کے رئیس آدمی تھے۔ زمین جائداد اچھی خاصی تھی۔ گاؤں بھر میں ایک دبدبہ تھا، گھر بجویٹ تھے۔ اچھے خاندان میں شادی ہوئی تھی اس لئے وہ خود کو کافی اہم سمجھتے تھے اور جب میں ان پر بگڑتا تو انہیں یہی احساس ہوتا کہ ان کی ساری حیثیت خاک میں مل گئی ہے۔

جب ان کا دماغ شانت ہوتا وہ میرے چیمبر میں آتے اور کرسی پر بیٹھ جاتے۔ میں ان کے دل کی کیفیت سمجھ جاتا پھر ان سے ان کی خیریت دریافت کرتا۔ تب وہ ہمت یکجا کر کہنے لگتے۔

"سر، آپ نے مجھے خواہ مخواہ ہی ڈانٹ دیا۔ اس وقت یہاں کملانند جھا بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے نہیں ڈانٹنا چاہئے تھا، وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟"

پھر وہ خاموش ہو جاتے۔ ان کے چہرے سے ان کے دل کی کیفیت کا اندازہ ہوتا کہ وہ کتنی گہرائی سے اس بات کو لے رہے ہیں۔ تب میں مسکرا کر کہتا۔

"گلاب بابو آپ ایسا کریں ان لوگوں کی ایک لسٹ مجھے دے دیں جن کے سامنے آپ کو نہیں ڈانٹنا چاہئے۔ میں آئندہ سے خیال رکھوں گا۔" وہ اندر ہی اندر کڑھتے پھر کہنے لگتے۔

"سر آپ دیکھتے ہیں۔ میں آتے ہی کتنا بزی ہو جاتا ہوں۔ پھر بھی آپ کہتے ہیں کہ میں کام نہیں کرتا۔"

میں ان کے بھولے پن پر مسکراتا اور ان سے ان کی عمر دریافت کرتا۔

"سر۔ اس میں عمر کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔" وہ بھونچکے رہ جاتے۔

"عمر کا سوال ہے گلاب بابو — اس سے عمر کا گہرا تعلق ہے۔" میں رکتا پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہتا۔

"ابھی آپ کی عمر ساٹھ سال نہیں ہوئی ہے اس لئے یہ باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

وہ میرا مذاق سمجھ جاتے اور مسکرانے لگتے۔

وہ یادو تھے اور ان کی ایک سالی کی شادی میرے گاؤں گوگی پوٹھیہ میں نتیا نند یادو کے چھوٹے بھائی سے ہوئی تھی اسی لحاظ سے میں ان سے ہلکا پھلکا مذاق بھی کر لیتا تھا جس کا وہ برا نہیں مانتے تھے۔ اپنی تساہلی کے باوجود وہ ایماندار آدمی تھے۔ انہوں نے کبھی غلط واؤچر میرے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ بلکہ ان کے سیکشن کا واؤچر بھی اکثر شرما جی ہی کام کے بعد پیش کیا کرتے تھے۔

روزانہ بس کے چکر سے نجات پانے کے لئے گلاب بابو نے ایک موپیڈ خرید لیا۔ موپیڈ سکنڈ ہینڈ تھا۔ روزانہ اس میں سات روپے کا پٹرول خرچ ہوتا تھا جبکہ بس میں صرف تین روپیہ لگتا تھا پھر بھی گلاب بابو خوش تھے کہ اب اپنی سواری ہے۔

جس دن وہ موپیڈ لے کر آئے، ہمارے اسٹاف نے ان کی جے جے کار کی اور انہوں نے سب کو چائے پلائی۔ جب بھی کوئی موپیڈ چلاتا تو وہ اس کے پیچھے دوڑے جاتے ارے ایسے نہیں ویسے نہیں — اور باقی اسٹاف ہنستے رہتے۔ دفتر کے سارے اسٹاف ان کے پیچھے پڑے رہتے۔ کبھی چشمہ چھپا دیا۔ کبھی چابی اور کبھی ان کا بیگ۔ وہ پریشان ہوتے اور ان لوگوں کے پیچھے دوڑتے رہتے آخر معاملہ چائے پر طے ہوتا اور ان

کی چیز انہیں واپس مل جاتی۔

یہ ایک دو دن کا معاملہ نہیں تھا بلکہ روزانہ کا معمول تھا۔ خاص کر کشوری نرائن ٹھاکر اور بھوشن ٹھاکر ان کے پیچھے پڑے رہتے۔ دونوں ٹھاکر روزانہ ان کی چائے پیتے۔ گلاب بابو اکثر مسکرا کر مجھ سے شکایت کرتے۔

دیکھتے ہیں سر ـــــ یہ دونوں ٹھاکر روز مجھ سے چائے وصول کر لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنسنے لگتے ان کے انداز میں شکایت کا جذبہ نہ ہوتا بلکہ ایک طرح کی خوشی ہوتی۔ روزانہ دو تین روپیہ ان کا ضرور خرچ ہو جاتا جس کی پرواہ انہوں نے کبھی نہیں کی۔

ان کی سادگی مروت اور خوش اخلاقی کی وجہ سے ہی میں انھیں برداشت کر رہا تھا۔ ورنہ کئی بار ان کے ٹرانسفر کا خیال بھی دل میں آیا جب بھی میں انہیں ٹرانسفر کی دھمکی دیتا وہ کافی نرم پڑ جاتے اور کہنے لگتے۔

"آپ جو بھی کام دیتے ہیں سر اسے تو میں کر ہی دیتا ہوں پھر بھی آپ ناراض ہو جاتے ہیں۔"

"آخر آپ کون سا کام کرتے ہیں کچھ بتائیے تو سہی۔" میرے دریافت کرنے پر وہ کہتے۔

"اس دن آپ نے اپنی غزل دی تھی میں نے ہندی میں اسے فیئر کر دیا تھا یہ کام میرا تو نہیں تھا پھر بھی میں نے کیا۔"

ان کی بات سن کر میں سر پیٹ لیتا۔ انہیں غزل تو یاد رہ گئی مگر یہ یاد نہیں رہا کہ دس دنوں سے اخبار کی کٹنگ نہیں ہوئی ہے۔ جن محکموں سے پوچھ تاچھ کرنی ہے ان کو لیٹر نہیں بھیجا گیا ہے۔ سوچنا کیندر کا اخبار سال بھر سے نیلام نہیں ہوا ہے۔ پٹنہ سے آئے ہوئے پوسٹر ابھی تک شہر میں

لگائے نہیں گئے ہیں۔ پھر بھی اس آدمی کو یہ احساس نہیں ہے کہ کوئی کام پینڈنگ بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ ہر گھڑی مصروف دکھائی دیتے تھے مگر ان کی محنت کا آؤٹ پٹ (Out put) کبھی سامنے نہیں آتا تھا۔

کبھی کبھی کوئی ضروری میٹنگ ہوتی تو اس میں شام ہو جاتی اور ان کی بس مس ہو جاتی۔ وہ ڈرائیور کو لے کر میرے ڈیرہ آتے اور بہت معصومیت سے کہتے۔

"سر ڈرائیور کو کہئے نا وہ مجھے گھر پہنچا دے۔ جانا بہت ضروری ہے سر۔"

"آخر کیا ضروری ہے؟ آپ رات رک جائیے کل دفتر سے سویرے ہی چھوڑ دوں گا۔" وہ بے چین ہو جاتے اور جلدی سے کہتے۔

"بہت ضروری ہے سر۔ گھر میں انتظار کر رہی ہوں گی۔"

یہی انتظار کرنا ان کے لئے بہت ضروری ہوتا۔ تب میں ان سے کہتا کہ چھوڑنے کے لئے آخر سرکار کو ڈیزل تو خرچ کرنا ہوگا ہی۔ وہ جھٹ جواب میں کہتے۔

"ڈیزل میں دے دوں گا سر۔" اور مجبوراً مجھے راضی ہونا پڑتا۔ کئی بار ایسا ہوا تھا کہ انہیں گھر چھوڑنے کے لئے مجھے جیپ دینی پڑی تھی۔ اس کے بعد میں انہیں دن میں ہی چھوڑ دیتا کہ ان کی بس مس نہ ہو۔

وہ جب بھی آفس میں رہتے سارا اسٹاف انہیں گھیرے رہتا اور وہ ان کے درمیان خواہ مخواہ مصروف ہونے کی کوشش کرتے۔

"تم سب مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔ دیکھ نہیں رہے ہو کہ کتنا ضروری کام کر رہا ہوں۔" مگر اسٹاف نہیں مانتے اور نعرہ لگانے لگتے۔

"بڑا بابو ــــ زندہ باد ــــ" وہ ہار کر ان کی طرف دیکھتے اور مسکرا کر کہتے۔

"چلو چائے پی لو اور میری جان چھوڑو۔" پھر نعرہ لگتا۔ "گلاب بابو ——— ——— زندہ باد۔"

دفتر کے سارے لوگ ان سے مذاق کرتے۔ منڈل جی، شرما جی اور ٹھاکر جی تو پیش پیش ہوتے مگر جھا جی جیسے سنجیدہ آدمی بھی کبھی کبھار چٹکی لے لیتے۔ یہاں تک کہ دفتر کا خلاصی نیتانند جھا بھی ان سے مذاق کر لیتا مگر وہ برا نہ مانتے۔

گلاب بابو کبھی فرصت لے کر گھر نہیں گئے۔ جب دفتر نہ آنا ہوتا گھر سے ہی درخواست بھجوا دیتے اور وجہ یہ ہوتی ——" دانت میں شدید درد ہے اس لئے آج دفتر نہ آسکوں گا۔" اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کی ہر درخواست میں یہی ایک وجہ ہوا کرتی کہ دانت میں شدید درد ہے۔ میں نے ایک بار مسکراتے ہوئے کہا بھی تھا۔

"گلاب بابو۔ آپ کے دانت پورے ہو گئے ہیں؟" وہ میری بات سمجھ گئے تھے اور خود ہی بڑی صاف گوئی سے کہا تھا۔

"نہیں سر۔ ابھی میری عمر ساٹھ سال نہیں ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھلے دل سے ہنسے تھے اور میں بھی کافی محظوظ ہوا تھا ان کے اس جواب سے۔

کچھ دن بعد وہ اچانک ایک پرانے اسکوٹر سے دفتر سے آئے سب نے حیرت ظاہر کی۔ انہوں نے خود ہی تفصیل سے وجہ بتائی۔

"یہ سالے کا اسکوٹر ہے۔ میں اسے ہی خریدنے والا ہوں۔ دو چار ہزار خرچ کر کے بالکل کنڈیشن میں آجائے گا۔"

اسکوٹر آجانے کے بعد بھی وہ اکثر دیر سے آتے۔ موپیڈ سالے کو دے دیا تھا اس لئے کبھی اسکوٹر لاتے اور کبھی موپیڈ۔ اکثر وہ دونوں ہی بگڑے رہتے

اور روزانہ ان پر کچھ نہ کچھ خرچ ہوتا اور اس طرح شام گئے تک گلاب بابو پور نیہ ہی میں رہتے۔

گذشتہ دسمبر میں الیکشن تھا۔ کاؤنٹنگ ہونے والی تھی۔ میں نے انہیں تاکید کی۔

"گلاب بابو آج آپ گھر نہ جائیں کیونکہ ۷ بجے صبح ہی کاؤنٹنگ سینٹر پر پہنچنا ہے وہاں کا انفارمیشن سینٹر آپ کو ہی سنبھالنا ہے۔"

"آپ جس وقت بھی کہیں میں گھر سے آجاؤں گا سر، بالکل وقت پر آپ ایکدم اطمینان رکھیں۔"

جاڑے کا موسم تھا۔ میں ان پر ترس کھا کر رہ گیا۔ مگر دوسرے دن جب میں سینٹر پر پہنچا تو گلاب بابو ندارد تھے۔ شرما جی سے بھی دریافت کیا وہ بولے کہ ابھی تک تو نہیں آئے۔ مجھے کافی غصہ آیا۔ ساڑھے آٹھ بجے گلاب بابو حاضر ہوئے۔ چہرہ دیکھنے کے لائق تھا۔ الیکشن کا معاملہ تھا انہیں فکر تھی کہ ہیں میں کوئی سیریس ایکشن نہ لے لوں۔ میں ان کی اس غیر ذمہ داری پر کافی بگڑا وہ سر جھکائے سنتے رہے پھر بڑی مسکینیت سے بولے۔

"میں تو وقت پر ہی پہنچتا سر۔ گھر سے بالکل سویرے چلا تھا۔ تیز تیز آرہا تھا کہ ٹم ٹم سے ٹکرا گیا۔ یہ دیکھئے میری حالت۔"

میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ گھٹنوں پر پینٹ پھٹ گیا تھا اور خون کے دھبے نمایاں تھے۔ دونوں کہنی بھی چھلی ہوئی تھی۔ ماتھے اور ناک پر بھی خراشیں تھا۔ مجھے ان پر رحم آیا اور میں نے انہیں سرزنش کی۔

"میں نے آپ سے بار بار کہا ہے کہ آپ موپیڈ تیز نہ چلائیں مگر آپ

مانتے ہی نہیں۔ اگر تم ٹم ٹم کے نیچے آجاتے تو۔ ؟" انہوں نے گردن جھکالی۔
یہی ان کا احساس جرم تھا۔

میں آفس میں رہتا تو وہ اکثر دیر سے آتے۔ مگر جب دورے پر ہوتا
تو وہ بالکل سویرے کبھی کبھی تو نو ہی بجے آجاتے۔ ان کے آتے ہی اسٹاف
بڑا بابو زندہ باد کا نعرہ لگاتے اور کہتے ۔" آج تو آپ ہی صاحب ہیں۔"
وہ کافی خوش ہوتے اور چائے کا دور چلتا۔

گذشتہ مئی میں جب میں چھ سات دن کی فرصت لے کر دفتر سے
جانے لگا تو گلاب بابو کو بلا کر تاکید کی۔

"گلاب بابو، میں کچھ دن دفتر نہیں آؤں گا۔ اس دوران ہر کام آپ
کے ذمہ ہوگا۔ آپ دفتر کا خیال رکھیں گے۔"

"آپ اطمینان رکھیں سر۔ میں ہر کام دیکھ لوں گا اور آپ کو شکایت
کا موقع نہیں دوں گا۔"

میں مطمئن ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ روزانہ سویرے ہی دفتر آئیں گے۔
ان کے آتے ہی ٹھاکر جی "بڑا بابو زندہ باد" کا نعرہ لگائیں گے پھر چائے
کا دور چلے گا۔ اور وہ شام میں ہی گھر روانہ ہوں گے۔ اور بیگم کے دریافت
کرنے پر کہیں گے۔

"تم جانتی نہیں ہو۔ ان دنوں صاحب نہیں ہیں اور ہر کام مجھے ہی دیکھنا
پڑتا ہے۔ اس لئے دیر ہو جاتی ہے۔" پھر وہ سینہ تان کر بیگم کو یہ احساس
دلائیں گے کہ یہ ہے میری حیثیت۔"!

میں چھٹی گذار کر آج دفتر آیا ہوں۔ دن کے ایک بجنے والے ہیں مگر اب تک
گلاب بابو نہیں آئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اب نہیں آئیں گے پھر بھی میں ان کا
انتظار کر رہا ہوں کہ شاید وہ آجائیں۔

شرما جی ان کے نہ آنے کی وجہ تفصیل سے بیان کر رہے ہیں۔

"آپ کے جانے کے تیسرے دن ہی ۲۲ مئی کو دفتر سے کافی دیر سے وہ نکلے۔ وہ موپیڈ سے اپنے سالے کے ساتھ گھر کی بجائے اپنی سسرال زنگ پورہ جا رہے تھے۔ موپیڈ کا ہیڈ لائیٹ فیوز ہو گیا تھا وہ اندھیرے میں ہی جا رہے تھے کہ وہ راستہ ان کا برسوں کا جانا ہوا تھا۔ کاجھا موڑ پر اچانک سامنے سے آتے ہوئے ٹم ٹم سے ٹکرا گئے اور ٹم ٹم کا سامنے سے نکلا ہوا بانس سارے کا سارا ان کے پیٹ میں۔۔۔۔"

وہ چپ ہو گئے ہیں۔ ان کی آواز بھرا گئی ہے۔ میرے کان سماعت سے محروم ہو گئے ہیں۔ پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ بس ابھی اسکوٹر کی آواز آئے گی اور گلاب بابو جھٹ سامنے ہوں گے۔ "بس ذرا دیر ہو گئی۔ دراصل وہ اسکوٹر راستے میں خراب ہو گئی تھی۔۔۔"

●●
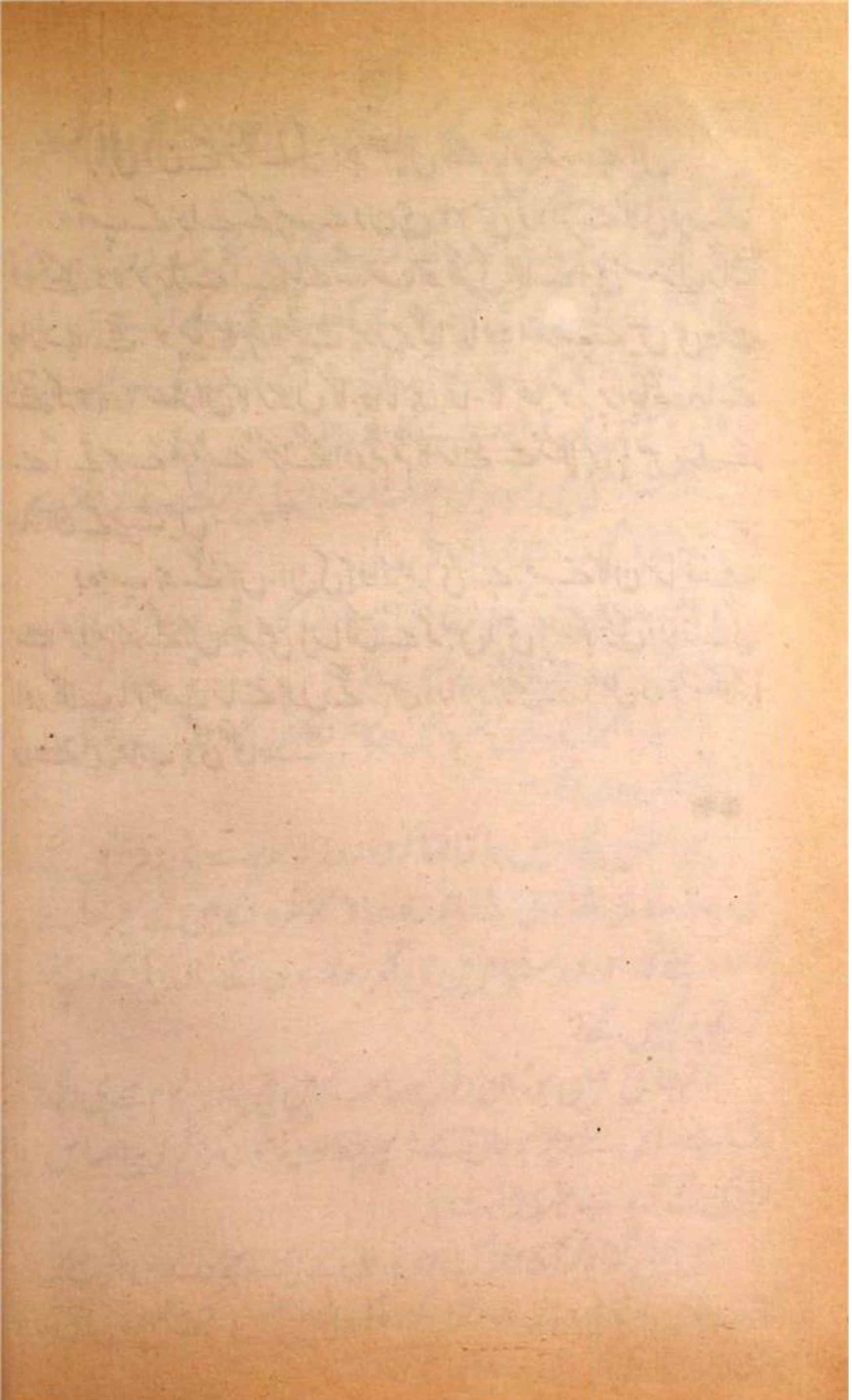
کوئی نام تو دو

کیا زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ یادیں ہی ہوتی ہیں ـــــ؟
شاید سچ بھی یہی ہے ـــــ کیونکہ زندگی میں جب سارے اپنے پرائے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تو یادیں ہی پاس رہ جاتی ہیں۔ اور اپنی وفا کا یقین دلاتی رہتی ہیں۔ اور واقعی جس کے پاس یادوں کا خزانہ ہو اسے دنیا میں اور چاہئے بھی کیا۔ انہیں یادوں کے سہارے آپ تنہائی میں محفل آراستہ کر سکتے ہیں اور خود کو ہر دکھ سے نجات دینے کے لئے یادوں کی پالکی پر سوار ہو کر زمانے بھر کی سیر بھی کر سکتے ہیں۔
آج میں بھی انہیں یادوں کے درمیان گھرا ہوا زمانے بھر کی سیر کر رہا ہوں۔
پندرہ اگست کا نام آتے ہی ذہن میں یادوں کے چراغ جھلملانے

لگتے ہیں۔ آزادی کی پوری لڑائی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ چاہے گاندھی جی کی چمپارن یاترا ہو یا بھارت چھوڑو تحریک۔ غیر ملکی اشیاء سے بائیکاٹ ہو یا سائمن کمیشن کے واپس جانے کا نعرہ، دار پر لٹکتے بھگت سنگھ ہوں یا اشفاق اللہ خان، گولیوں کا تحفہ قبول کرتے ہوئے جلیان والا باغ کے شہید ہوں یا جوانی میں آزادی کی خاطر دار پر لٹکتے خودی رام بوس ہوں۔ غرض کہ آزادی کی پوری لڑائی کے درمیان بھارت کے سپوت اپنا خون دے کر اسے غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے پر اتاولے نظر آتے ہیں۔

اور آج اتنی قیمتی آزادی کو ہم نے اپنے دلوں سے نکال کر سرکاری گودام میں بند کر دیا ہے۔ یہ آزادی جو کل تک ہر ایک شہری کی امانت تھی آج سرکاری تحویل میں قید ہے۔ ہر سال اسے پندرہ اگست کے دن ہم باہر نکالتے ہیں۔ جھاڑ پونچھ کر، دھوپ اگربتی جلا کر اس کی آرتی اتارتے ہیں۔ دو چار جوشیلے نعرے بلند ہوتے ہیں اور شام میں تھوڑی سی رنگینی بکھیر دی جاتی ہے اور پھر یہ آزادی سال بھر کے لئے سرکاری تحویل میں چلی جاتی ہے۔

شام میں رنگینی بکھیرنے کے لئے عام طور پر رنگا رنگ پروگرام مرتب کئے جاتے ہیں اور ضلعی لیول پر یہ ذمہ داری میرے ہی سپرد کی جاتی ہے اور میں کلاکاروں کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہوں۔

"کلاکار ــــــ؟"

سب سے بڑے کلاکار تو باٹو دا ہیں۔ پورنیہ میں تھا تو معلوم ہوا کہ پوری سنگیت لوٹی انہیں کے دم سے قائم ہے۔ اور انہوں نے اپنی زندگی اس ادارے کے لئے وقف کر دی ہے۔ اس لمبے تڑنگے ادھیڑ عمر شخص کا نام تو کالیکا پرساد چٹرجی تھا مگر پیار سے باٹو دا کہے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی

زندگی میں بیوی کے آنے کی ساری گنجائش کو رد کر دیا تھا اور اس کی جگہ پوری سنگیت ٹولی آبسی تھی۔

باڈدا نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ کھلے دل کے آدمی وسعت اتنی کہ سارا زمانہ سما جائے۔ جب بھی پندرہ اگست آتا میں جھٹ حاضر ہوجاتا۔

"باڈدا ـــ پروگرام پیش کرنا ہے انتظام تو آپ ہی کو کرنا ہے ـ" وہ مسکراتے ہوئے کہتے۔

"پروگرام آپ کا ـــ اور انتظام میں کروں ـ؟"

پھر وہ ایک جاندار قہقہہ لگاتے اور میں بھی شریک ہوجاتا۔ پھر چائے کا دور چلتا۔ باڈدا سگریٹ کا دھواں چھوڑتے اور پھر کلاکاروں کی لسٹ تیار ہوتی۔

"غزل کے لئے نندہ چٹرجی سے زیادہ پیاری آواز کہاں ہے؟ مگر اسے تو پٹنہ سے بلانا ہوگا۔ اشیش راہا اندھا ضرور ہے مگر اس کے دل کی آنکھیں بہت روشن ہیں۔ بالکل غلام علی کی آواز میں گاتا ہے۔ اور ڈانس کے لئے لی لی سے بہتر ہے بھی کون؟ گٹار اور کلاسیکل گانے کے لئے تو سمیتا تیار ہوجائیگی اور بھجن کو اپنی سریلی آواز میں ڈھالنے کا فن موَلی سے بہتر کسے آتا ہے؟ اور ہاں للّو دتا تو طبلہ پر سنگت کرے گا ہی۔ اور استاد نند کشور تو ہارمونیم پر رہیں گے ہی اور یہ بھی ممکن ہے اُوما بابو اپنے کلاکار بچوں کے ساتھ آجائیں۔"

پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتے۔

"اور اسٹیج پر مائک تھامنا سب کے بس کا روگ تھوڑے ہی ہے۔ یہ تو بس آپ ہی کا حصہ ہے۔"

"اور آپ باٹودا۔۔۔؟" میرے استفسار پر وہ کہتے۔

"ارے بھائی میں تو پردے کے پیچھے کا آدمی ہوں۔ اور۔۔۔۔"

"۔۔۔۔اور ہر کلا کار میں آپ کی ہی جھلک ہوتی ہے۔" میں ان کی بات کاٹ کر کہتا۔ اس کے بعد ہم دونوں کی ٹولی ریہرسل کے نام پر کلا کاروں کو دن رات پریشان کرتی اور ہمارے سارے کلا کار بڑی محنت سے ہمارا ساتھ دیتے۔ پھر پندرہ اگست کی شام ہم ٹاؤن ہال میں پروگرام پیش کرتے۔ پورنیہ میں تھا تو کلا کاروں کی کمی نہ تھی پروگرام پیش کرنے میں بھی بہت مزہ آتا تھا مگر وہ سب تو اب ماضی کا حصہ ہو گیا ہے۔ وہاں کا آخری پروگرام آج بھی یاد ہے۔

ایک دن اسی پروگرام کی بات چل رہی تھی کہ میرے عزیز دوست پروفیسر اصغر عالم آگئے اور اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے۔

"اس بار آپ کے پروگرام کا بہت چرچا ہے جناب مگر پدا دھیکاری مہودے میں تب جانوں جب آپ کلپنا بنرجی کا پروگرام لے لیں۔"

"یہ کس چڑیا کا نام ہے سرکار۔۔؟ اور یہ کس عجائب گھر میں پائی جاتی ہے؟" میں نے بھی اسی انداز میں کہا۔

"اس لڑکی نے اس بار میرے کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ میوزک میں ایم اے کر چکی ہے اور سات سُروں کا سنگم اپنے گلے میں بسائے ہوئے ہے۔ مگر آج تک اس نے کسی اسٹیج پر نہیں گایا۔" باٹودا نے بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا "وہ میرے دوست ڈاکٹر بنرجی کی لڑکی ہے اور بہت ریزرو ہے۔"

میں خاموش رہ گیا۔ مگر میرے اندر کا فنکار جاگ گیا۔ ایسا محسوس ہوا کسی نے میری انا کو للکار دیا ہو۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اسے اسٹیج پر لا کر ہی

رہوں گا۔ اسی دن اپنے پروفیسر دوست کے ساتھ اس کے یہاں جا پہنچا۔

پروفیسر صاحب نے میرا تعارف کرایا پھر آنے کا مقصد بتایا۔ کلپنا نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں اور تھوڑی دیر کے لئے تو میں سہم ہی گیا۔ ان نگاہوں میں ضرور کوئی جادو رہا ہوگا۔ پھر اس نے بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"میں نے یہ کلا صرف اپنے لئے سیکھا ہے۔ یہ صرف میری ذات تک محدود ہے۔ میں اس کا پردرشن کرنا نہیں چاہتی۔ ہر شخص کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے میں بھی اپنے اسی نظریئے پر قائم ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم بنگالی لوگ اپنے ادارہ درگا باڑی سے بہت اٹیچڈ ہوتے ہیں مگر میں نے وہاں کے فنکشن میں بھی نہیں گایا۔"

تھوڑی دیر وہ رکی پھر بولنے لگی۔

"ہاں۔ میں نے صرف کالج کے سالانہ فنکشن میں گایا ہے وہ بھی صرف اس لئے کہ کالج میری وہ ماں ہے جہاں سے میں نے یہ وِدّیا حاصل کی ہے۔"

وہ رکی، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں بہت مجبور ہوں سر، اور آپ کی بات نہ ماننے کا بھی مجھے بہت دکھ ہے۔" اس کے بعد پروفیسر صاحب نے میری طرف دیکھا جس کا مطلب تھا۔

"اب چلئے حضرت، جواب آپ نے سن لیا۔ یہاں دال نہیں گلنے والی۔"

مگر میں ہار ماننے والا کب تھا۔ میں نے کلپنا کی طرح ہی حسین کلپنا کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی کچھ عرض کروں۔"

"ہاں ہاں شوق سے۔" اس نے مسکرا کر اجازت دے دی۔ تب میں نے بہت ہی نپے تلے الفاظ میں اپنی بات شروع کی۔

"مس کلپنا۔ آپ کا یہ جذبہ واقعی قابلِ احترام ہے اور میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ اور ان حالات میں، میں آپ کو مجبور بھی نہیں کروں گا۔" میں رکا، پھر گویا ہوا۔

"ابھی آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نے کالج کے فنکشن میں صرف اس لئے گایا تھا کہ کالج وہ ماں ہے جس نے "سُر" دیا آپ کو دی ہے، یہ جذبہ بھی واقعی قابلِ ستائش ہے۔" میں نے رک کر اس کی نگاہوں میں جھانکا پھر اپنی بات جاری رکھی ——!

"مگر کلپنا جی —— میں آپ سے ایک ماں ہی کے لئے پروگرام لینے آیا تھا اور یہ ماں بہت بڑی ہے اس ماں سے بھی بڑی ہے جس نے ہمیں جنم دیا ہے۔" اس کی نگاہوں میں تجسس کا عکس جھلکتا دیکھ کر میں نے کہا۔

"کالج تو بہت چھوٹی سی ماں ہے —— مگر ہماری ماتر بھومی وہ ماں ہے جس کے کروڑوں سپوت ہیں۔ اور اس ماں کی زندگی میں آج کا دن بہت ہی اہم ہے۔ یہی وہ دن ہے جس کی پراپتی کے لئے آپ جیسی کتنی بہنوں کے ہاتھوں میں راکھیاں جھولتی رہ گئیں مگر انہیں وہ کلائی نصیب نہ ہوسکی جس پر راکھی کے پھول کھل سکتے کتنی مانگوں سے سیندور جدا ہو گیا اور اس پر سہاگ کا خون بکھر گیا۔ کتنی ماؤں کی گود ویران ہو گئی اور کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ مگر کسی نے اُف تک نہ کی —— صرف اس لئے کہ اتنی ساری قربانیوں کے بعد وہ دن ہاتھ آنے والا تھا جو سب سے عظیم تھا۔ سب سے قیمتی تھا۔"

میں نے رک کر اپنی باتوں کا ردِ عمل اس کی آنکھوں میں تلاش کیا پھر کہنے لگا۔

"اس دن کی حیثیت ہمارے لئے تہوار جیسی ہے اور یہ وہ جشن ہے جسے سارے بھارت باشی کو مل کر منانا چاہیئے۔ مگر آج ہم فرقوں میں بٹ کر عید اور ہولی منا لیتے ہیں۔ بقر عید اور درگا پوجا مناتے ہیں اور نہیں مناتے تو یہ جشن نہیں مناتے جو سب کا ہے۔ اس میں سب کا یوگ دان ہے۔ صرف اس لئے کہ آج پرکھوں کی عظیم قربانیاں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ھیں۔"

تھوڑی دیر کے لئے میں چپ ہو گیا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"کلپنا جی ـــــ آج ہم اسی ماں کی آزادی کا جشن منانے جا رہے ہیں اور آپ جب اتنی چھوٹی سی ماں کے لئے اپنا اصول توڑ سکتی ہیں تو اتنی بڑی ماں کے لئے انکار کیسے کریں گی ؟"

اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ کلپنا تھوڑی دیر تک میری طرف دیکھتی رہ گئی پھر اس کی دراز پلکیں جھک گئیں۔ وہ بغیر میری طرف دیکھے نگاہوں سے فرش کریدتے ہوئے بولی۔

"آپ نے میری ہی باتوں سے مجھے اس طرح قائل کر دیا ہے کہ نکل بھاگنے کے سارے دروازے بند ہو گئے ہیں اور انکار کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی ـــــ" وہ خاموش ہو گئی پھر بولی۔

"میری بھی ایک شرط ہے۔ میں آپ کے پروگرام میں بس اتنی ہی دیر رہوں گی جتنی دیر میرا پروگرام ہو گا۔ اس کے لئے آپ میرے پروگرام سے قبل جیپ بھیج دیں گے اور پروگرام کے فوراً بعد مجھے گھر پہنچا دیں گے۔"

اس میں بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہاں سے واپس ہوتے ہوئے میں اس فاتح کے مانند محسوس کر رہا تھا جس نے بہت بڑا معرکہ سر

کرلیا ہو۔

وہ شام میرے لئے یادگار بن گئی۔ اس زمانے میں کے، این، ہشرا کلکٹر تھے اور ایسے پروگرام میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی وجہ سے سارے آفیسرز بھی موجود تھے۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اور سارے کلاکار اپنے فل فارم میں تھے۔

کلپنا کی خواہش کے مطابق ہی میں نے اسے بلوایا۔ جب وہ گرین روم میں داخل ہوئی تو میری نگاہیں تابِ حسن نہ لاکر جھک گئیں۔ سولہ سنگھار کیا ہوتا ہے اسی دن پتہ چلا تھا۔ اُدھر وہ مسکرائی اِدھر میرے دل کا قلعہ ڈھہتا ہوا محسوس ہوا۔

اور جب میں مائک پر کلپنا کا نام اناؤنس کرنے آیا تو مائک پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ میں نے اپنے سارے الفاظ اس کی تعریف میں خرچ کردیئے اور اسے اتنا اونچا اٹھا دیا کہ ہر کوئی سانس روکے منتظر تھا کہ دیکھیں کون سا گوہر نایاب آج پہلی بار اسٹیج پر پیش کیا جا رہا ہے۔ کلپنا کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ میں بھی اسٹیج کا فنکار ہو سکتا ہوں۔ اس نے اپنی مخمور نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان اسٹیج تک آئی۔

اس نے ایک گانے کی بجائے پانچ گانے گائے۔ مگر پھر بھی سامعین "ونس مور" کی صدا لگاتے رہے۔ بلاشبہ اس نے بھی میرے الفاظ کی لاج رکھ لی تھی اور فن کی ساری بلندیوں کو چھو لیا تھا۔

اسٹیج سے اترتے ہی میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جیپ اس کی منتظر ہے۔ لیکن اس کا جواب سن کر مجھے کافی حیرت ہوئی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں اب آپ کا یہ پروگرام آخر تک دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اور جب پروگرام ختم ہونے پر میں اسے جیپ تک چھوڑنے گیا تو اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑی لجاجت سے کہا۔

"آپ سے ایک گذارش اور ہے سر ـــ آپ مجھ سے دوبارہ انورودھ نہیں کریں گے کیونکہ میں شاید آپ کی بات ٹال نہیں سکوں گی اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ مجھ پر اسٹیج کی چھاپ لگ جائے۔"

میں نے اس سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ ہاں اس کے اس تعاون کا بھرپور شکریہ ضرور ادا کیا تھا۔ اس رات میں جاگتا رہا تھا ـــ بیگم نے تنہائی پاکر بڑی گہری مسکراہٹ کے درمیان کہا تھا۔

آج آپ میں کس اناؤنسر کی روح حلول کر گئی تھی، الفاظ کا اتنا بڑا خزانہ کہاں سے مار لائے تھے؟" ـــ

اس کے بعد میں کلپنا کے یہاں کبھی نہیں گیا۔ ہاں اس کلپنا کو اپنی کلپنا میں ضرور بساتا رہا تھا۔ آواز کا وہ جادو میں بھول بھی کیسے سکتا تھا ـــ؟

اور سال بھر بعد جب میں پورنیہ چھوڑنے لگا تو اپنے سارے کلاکاروں کے یہاں گیا اور ان کے تعاون دیتے رہنے کے لئے ان سب کا شکریہ ادا کیا۔ مگر میں چاہ کر بھی کلپنا کے یہاں نہیں جا سکا۔ نہ جانے یہ کون سا جذبہ تھا جو میرے قدم روکے ہوئے تھا۔ "عشق کی خودی ـــ یا فنکار کی انا ـــ؟" میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں نہ جا کر بھی میں اپنی فتح پر شاداں ضرور تھا۔

پورنیہ کی آخری شام آج بھی یاد ہے ـــ

میرا سارا سامان اور بچے جا چکے تھے۔ میں وہ آخری شام بالکل تنہا

گذارنا چاہتا تھا۔ اپنے برآمدے میں بیٹھا میں یادوں کی بھول بھلیوں میں گم تھا کہ اچانک چوڑیوں کی کھنک نے مجھے چونکا دیا۔ سامنے کلپنا کھڑی تھی۔ واقعی وہ کلپنا ہے یا میرا وہم ــــ؟ میں آنکھیں جھپکاتا ہوں کہ آواز آتی ہے۔

"بیٹھنے کو بھی نہ کہیں گے ــــ؟"

میں چونک پڑتا ہوں اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ وہ بغیر کسی انتظار کے شکایت بھرے لہجے میں کہہ رہی ہے۔

"آپ اس دن کے بعد اس طرح اچانک غائب کیوں ہو گئے؟ میرا قصور کیا تھا؟ آپ سب کے یہاں گئے مگر میرے یہاں نہ آنے کی قسم کھالی۔"

تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہی پھر میری طرف نم آنکھوں سے دیکھتی ہوئی بھرائی آواز میں کہنے لگی۔

"آپ کل یہ جگہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ہم سب سے دور ــــ جاتے وقت بھی آپ نہ آئے۔ میں نے کس طرح پل پل آپ کا انتظار کیا ہے۔ آپ کیا جانیں؟ میں نے اپنا اصول صرف آپ کے لئے توڑا تھا۔ صرف آپ کے لئے ــــ نہ جانے آپ کے سامنے میں کیوں ہار گئی تھی۔ بے بس ہو گئی تھی۔ آپ ایک بار کیا، ہزار بار بھی کہتے تو میں گاتی ــــ مگر....."

اس کی آواز کانپنے لگی اور باقی الفاظ آنسوؤں میں بہہ گئے۔

میں حیران ہوں۔ "یہ کون سا جذبہ ہے؟"

"اسے میں کون سا نام دوں ــــ؟؟"

مگر پھر خیال آتا ہے۔

کچھ جذبے انام ہوتے ہیں۔ انہیں نام دے کر میلا نہیں کیا جا سکتا۔!!

حرفِ آخر

وہ کب تک بے ہوش رہا اسے یاد نہیں۔

گھنٹہ دو گھنٹہ، ہفتہ یا مہینہ بھر ———

اس نے جب آنکھ کھولی تو اسے احساس ہوا کہ شاید وہ صدیوں سے بے ہوش رہا ہے یا اصحابِ کہف کی طرح بہت ہی لمبی نیند کے بعد نیند سے بیدار ہوا ہے۔

وہ جب بے ہوش ہوا تھا تو اس کی بیوی بچے اس کے پاس تھے۔ سب سے بڑی لڑکی تھی جس کے ہاتھ پیلے کرنے کا ارمان برسوں سے اس کے دل میں پل رہا تھا۔ اس سے چھوٹا ایک لڑکا تھا جو اسی سال کالج میں داخل ہوا تھا اور بیوی تھی جو دمہ کی مریض تھی اور برسوں سے سانس کے

جھولے پر جھول رہی تھی۔

بچوں کو یاد کر کے اس نے اچانک سوچا۔

یہ سب اچانک کیسے ہوگیا ــــ؟

مگر یہ سب اچانک تو نہیں ہوا تھا ــــ

یہ سلسلہ تو آدم کے زمانہ سے جاری تھا مگر اب اس کا روپ قدرے بدل گیا تھا۔ اس نے جب آنکھ کھولی تھی تو زلزلے کے زبردست جھٹکے محسوس ہوئے تھے اس تاریخی زلزلے کے ملبے آج بھی اس تباہی کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ وہ زندہ بچ گیا تھا یہ کسی معجزہ سے کم تو نہ تھا۔

پھر وہ زندگی کی دیگر بھول بھلیوں میں گم ہو کر خود کو بھی بھول گیا ــ وہ اپنے خول میں اس وقت لوٹا جب بوڑھے باپ نے کہا تھا۔

" بیٹا ــــ اب روزی کی تلاش کرو۔ میں ریٹائر ہو گیا ہوں۔"

زندگی کا بوجھ اچانک اس کے کندھوں پر آگیا اور یہ بوجھ دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ اس نے کتنے انقلابات دیکھے۔ دوسری جنگِ عظیم دیکھی۔ تباہی کی داستان سنی ــــ پھر آزادی کی لڑائی اور اس کے بعد تو وہ جیسے جنگ دیکھنے اور اس کی تباہی کی داستان سننے کا عادی ہوگیا۔ اس سرزمین کے کسی نہ کسی حصے پر روزانہ جنگ کی خبریں آتیں۔

عراق و ایران کی جنگ ــــ دس لاکھ لوگوں کی لاش کا تحفہ ــــ

افغانستان اور مجاہدین کے درمیان جنگ ــــ ہزاروں افراد موت کے منہ میں ــــ

اسرائیل و فلسطین کے درمیان لڑائی ــــ روزانہ لاشوں کی تعداد میں اضافہ۔

پنجاب میں آتنک وادیوں کی دہشت گردی ــــ ہر روز معصوم لوگوں کا خون ــــ

بنگال میں گورکھا لینڈ ــــ آسام میں خلفشار ــــ میرٹھ میں فساد ــــ

یہ سب سن کر وہ سوچتا ــــ

یہ سلسلہ کب ختم ہوگا ــــ ؟

"تیسری جنگِ عظیم کے بعد ــــ"

اس کی بیٹی نے جواب دیا تھا۔ مگر اس کی بیٹی یہ سب کیسے سمجھ لیتی ہے۔؟

"کیا تیسری جنگِ عظیم کے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔؟"

"ہاں ــــ شاید ہمیشہ کے لئے ــــ" تب وہ شدت سے سوچتا۔

"کب ہوگی وہ جنگ ــــ؟!" وہ اس جنگ کا انتظار بڑی شدت سے کرنے لگا۔

اچانک اس کے پیٹ میں کلبلاہٹ ہوئی۔ بھوک کی شدت نے اس کی سوچ کے دھارے موڑ دیئے۔ وہ اپنے حال میں لوٹا اور اس نے خود کا جائزہ لیا۔ اس کے پورے بدن پر مٹی سنی ہوئی تھی۔ پیٹ کا چمڑا جھلس گیا تھا اس میں جلن کا جان لیوا احساس تھا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا ــــ کہیں بھی زندگی کے آثار نہیں تھے۔ وہ جہاں تھا وہاں صرف کھنڈر ہی کھنڈر تھے ــــ یہ کھنڈر شاید اس کا گھر رہا ہوگا۔ گھر کا نام یاد آتے ہی وہ اچانک پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا۔

"میں کہاں ہوں ــــ ؟"

اچانک اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ اس نے دیکھا وہ کسی لاش سے ٹکرایا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ چیخ پڑا۔

"میرے بیٹے ـــ یہ تجھے کیا ہو گیا ـــ؟"

وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑانے پر حد نگاہ تک کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ خاک و خون کے سوا کچھ نہیں۔ آسمان بھی دھندلکوں میں گم تھا۔ اس نے دھند چھٹنے کا انتظار کیا شاید سورج کی روشنی زمین تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ سارے نباتات و حیوانات موت کی آغوش میں گم ہو چکے تھے۔ ایسا محسوس بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں زندگی کے آثار بھی رہے ہوں گے۔ اس کے سر سے قیامت گذر گئی تھی اور یہ ساری تباہی اسی قیامت کی دین تھی۔

وہ بھوکا پیاسا مارا مارا پھرتا رہا۔ پھر اس کی ملاقات اس کی بیٹی اور بیمار بیوی سے بھی ہو گئی۔ بیوی شدید زخمی تھی اس کا ایک پاؤں غائب تھا۔ دایاں ہاتھ آدھا صاف تھا۔ خاک و خون میں لپٹی وہ زندگی اور موت کے درمیان جھولا جھول رہی تھی۔ بیٹی کو بھی گہرے زخم آئے تھے۔ چہرہ جھلس گیا تھا ایک آنکھ روشنی سے محروم ہو چکی تھی اور پاؤں پر بھی گہرے زخم کے نشان تھے۔ وہ دونوں زندہ تھے یہی کچھ کم نہ تھا۔

وہ دونوں کی تیمارداری میں جٹ گیا۔ بیٹی کے زخم جلد ہی بھر گئے مگر بیوی سانس کے جھولے پر جھولتی رہی۔ جب ان کے ہوش ٹھکانے آئے تو بیٹی نے بہت مغموم آواز میں باپ سے کہا۔

"دیکھا بابا ـــ میں نہ کہتی تھی کہ تیسری جنگ عظیم ہمیں ہر دکھ سے نجات دے دے گا۔"

وہ سوائے بیٹی کا منہ تکنے کے اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

وہ برسوں گھومتے رہے۔ ان کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ چاروں طرف انسانوں

اور جانوروں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں انہیں کھانے کے لئے چیل کوے بھی زندہ نہیں بچے تھے۔ گدھ کا بھی آج تک پتہ نہیں تھا۔

اتنے لمبے عرصے میں جب ان کی کسی اور نسل آدم سے ملاقات نہ ہوئی تو اچانک انہیں خود کے بہت اہم ہونے کا احساس ہونے لگا۔

"اس کا مطلب ہے ___ پوری نسل آدم ختم ہو چکی ہے اب صرف ہم تین ہی باقی ہیں۔"

مگر دوسرے لمحے ہی انہیں اپنی بے بسی کا بھی احساس ہونے لگا۔

"ہم تنہا جی کر کیا کریں گے۔؟"

وہ کسی طرح زندہ تھے۔ ایک دن بیوی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ سانس کے جھولے پر جھولتے ہوئے اس نے اتنی لمبی پینگ ماری کہ بہت دور نکل گئی۔ اور مرتے ہوئے اس نے اسے اشارے سے قریب بلایا۔ وہ جب اس کے قریب گیا تو وہ دھیرے دھیرے کہنے لگی۔

"یہ پوری زمین نسل آدم سے خالی ہو چکی ہے۔ مگر ابھی اس نسل کو زندہ رہنا ہے کیونکہ بہت کچھ کرنا باقی ہے۔"

"میں تنہا کیا کر سکتا ہوں۔"

"آدم بھی اس زمین پر تنہا ہی تھے۔"

"مگر ان کی دل بستگی کے لئے حوا ان کے ساتھ تھیں مگر تم تو مجھے تنہا کئے جا رہی ہو۔"

"نہیں ___ تم تنہا نہیں ہو۔" اس نے ایک ہچکی لی اور بیٹی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹی آؤ ___ میرے قریب آؤ کہ میں تم سے بہت دور جا رہی ہوں۔"

اس نے دونوں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں جا رہی ہوں۔ مگر تم دونوں سے ایک آخری وعدہ لینا چاہتی ہوں۔"
اس نے پھر ایک لمبی ہچکی لی۔ دونوں نے اس مرتے ہوئے وجود سے ایک زندہ وعدہ کر لیا۔

"ہم اپنے وعدہ کا پاس رکھیں گے اور تمہاری روح کو شرمندہ نہیں ہونے دیں گے۔"

تب اس نے دونوں کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"اب تم دونوں ہی آدم و حوا ہو۔ اور نسلِ آدم کے پھلنے پھولنے کا سلسلہ تمہیں سے شروع ہونا ہے۔"

●●

کانٹے کی خوشبو

وہ ساری رات سو نہیں سکا تھا۔ اس کی آنکھیں انگارے کی مانند دہک رہی تھیں۔ وہ ریگستان میں بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح تھا۔ سارے راستے حالات کی آندھی میں چھپ گئے تھے۔ حدِ نظر تک صرف ریت ہی ریت تھی۔

وہ اس کش مکش سے جلد نجات پانا چاہتا تھا اسے جلدی اس لئے بھی تھی کہ اب شمیم اس راز کو زیادہ دنوں تک چھپائے بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ نسیم کا یہ چوتھا مہینہ تھا۔ اب بچے کا ڈھانچہ مکمل ہو جائے گا۔ پھر اس میں جان ڈال دی جائے گی۔ پھر ـــــ پھر..... اور پھر یہ سلسلہ اسے ایک ایسے گلشن میں لے جاتا جہاں ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے ہوتے۔ وہ پھول کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتا مگر اس کی انگلیاں کانٹوں

سے الجھ کر لہولہان ہو جاتیں۔ اور کانٹوں کی چبھن اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی۔

وہ انجانے طور پر شبانہ سے گھبرانے لگا۔ اس سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت وہ خود میں نہیں پا رہا تھا۔ اسے ہر لمحہ یہ احساس ہوتا کہ اس نے شبانہ کے ساتھ غداری کی ہے۔ اس کے یقین کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اس سے بے وفائی کی ہے اور وہ اس کا گنہ گار ہے۔

مگر ـــــ پھر اس کے سوچ کے دھارے بدل جاتے۔ شبانہ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے یہ سچ ہے مگر اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسے بچے کا سکھ نہیں دے سکتی۔ اس کی موت کے بعد اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ کچھ بھی نہیں رہے گا اسے زندہ رکھنے کے لئے۔ پھر شبانہ کے پیار کے سہارے زندگی بھر سپنا بھی تو نہیں دیکھا جا سکتا۔ امید ہو تو آدمی کچھ دن اس کی ڈور تھامے زندگی گذار سکتا ہے۔ مگر خالی گھڑا پیاس تو نہیں بجھا سکتا ـــــ؟

اس کا ذہن اسی طرح قلابازیاں کھاتا رہتا۔ کبھی وہ سوچتا کہ اس میں شبانہ کا قصور بھی کیا ہے۔ یہ تو قدرت کا کھیل ہے۔ شبانہ تو فقط ایک کردار ہے جس نے اسے ٹوٹ کر چاہا ہے اور اس کی زندگی کا سارا دکھ درد اپنے آنچل میں سمیٹ لیا ہے ـــ ایسی بیوی کو ـــــ

نہیں ـــ نہیں ـــ وہ اسے طلاق نہیں دے سکتا۔ ہرگز نہیں دے سکتا۔ اس معصوم پر ہرگز یہ ستم نہیں ڈھا سکتا ـــ

فیصلے کی گھڑی سوا نیزے پر آ گئی تھی مگر اس کے سامنے سارے راستے بند پڑے تھے۔ وہ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ شبانہ سے اس کی یہ

حالت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ایک دن جب وہ اپنی دکان سے واپس آیا تو شبانہ نے اس کا کوٹ اتارتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ چہرے پر مردنی سی کیوں چھائی رہنے لگی ہے۔حضور کی ساری شگفتہ مزاجی کہاں غائب ہو گئی ہے ان دنوں؟"

"کچھ نہیں شبّو ــــ بس یونہی ذرا طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس نے ٹالنا چاہا۔

"یہ بہانہ نہیں چلے گا اب کوئی نیا تلاشیئے..." پھر اس نے ہنستے ہوئے دریافت کیا۔

"کہیں شمیم سے تو جھگڑا نہیں ہو گیا۔ ادھر وہ بھی گم سم سی رہنے لگی ہے۔"

شمیم کا نام سنتے ہی وہ سٹپٹا گیا۔پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔

"نہیں ڈیر ــــ یہ سب کچھ نہیں ہے۔" پھر اسے اپنی باہوں میں بھرتے ہوئے بولا۔

"پیار سے بنائی ہوئی چائے ساری شگفتہ مزاجی لوٹا لاتی ہے۔"

شبانہ مسکراتی ہوئی چلی گئی مگر اس کے لئے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان چھوڑ گئی۔ وہ نشان پھیلتا چلا گیا۔اور پھیلتے پھیلتے ایک بڑے دائرے میں تبدیل ہو گیا ــــ دائرہ ــــ ... چاروں طرف سے بند ــــ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

ادھر شمیم کی بھی شوخی غائب ہو گئی تھی۔حالانکہ سولہ سترہ سال کی عمر سنجیدہ ہونے کے لئے نہیں ہوتی۔مگر وہ سنجیدگی کا خول لئے سوالوں کے ریگستان میں بھٹک رہی تھی۔ آخر وہ کرتی بھی کیا؟ وہ لاکھ حوصلہ مند سہی مگر ہے تو سماج کی ایک کمزور ہستی ــــ .... ریت کی دیوار کی مانند ــــ حالات کے ایک جھونکے سے بکھرنے والا وجود ــــ جس سماج میں وہ سانس لے رہی تھی،

اس کے بھی کچھ اصول تھے۔ پابندیاں تھیں، رسم ورواج تھے تہذیب وتمدن کے کچھ دائرے تھے جس سے نکلنا ناممکن تھا۔

وہ ہمت کر کے اگر سارے سماجی بندھنوں کو توڑ بھی دیتی، ساری بدنامیاں سہہ بھی لیتی، نئی مثال قائم بھی کر دیتی، تو کیا ہوتا ——؟ کیا اس کی فتح ہو جاتی —؟ نہیں —— صرف اس لئے کہ اس میں اپنے مذہب کے بنائے ہوئے اصول کو پھلانگنے کی ہمت نہیں تھی جس نے سگی بہنوں سے ایک ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کی دو ہی صورتیں تھیں — یا تو شبانہ کو طلاق دیا جائے یا پھر اس کی موت ہو جائے —— ان ہی دو صورتوں میں شمیم اس کی ہو سکتی تھی اپنے بچے کو باپ کا نام دے سکتی تھی۔ اپنے ماتھے پر کلنک —— نہ لگنے دینے کی کوئی تیسری صورت اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔

شبانہ اس کی سگی بہن ہے۔ جو ٹوٹ کر اسے چاہتی ہے۔ اسے اونچی تعلیم دلانے کے لئے ہی وہ اسے دیہات سے یہاں لے آئی تھی تاکہ کالج میں پڑھے اور اس کا مستقبل تابناک ہو۔ وہ یہاں اسے اپنی بیٹی کی طرح چاہتی ہے، اس کی ساری ضرورتوں کا خیال رکھتی ہے۔ مگر وہ یہ کیا کر بیٹھی ——؟

اس میں صرف اس کا ہی قصور نہیں ہے بلکہ جاوید کا بھی ہے اور شبانہ کے اس یقین کا بھی ہے جو اس نے اپنے شوہر جاوید اور بہن شمیم پر کیا تھا۔

شمیم کے ذہن میں طوفان برپا تھا۔ وہ خود یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا کرے۔ وہ اپنی خود غرضی کے لئے شبانہ سے اس کی زندگی نہیں چھین سکتی تھی اور نہ ہی اسے زندگی کے اندھیرے میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ سکتی تھی۔

"مگر اسے بھی تو سہارا چاہئے۔ اپنے ہونے والے بچے کے، باپ کا نام چاہئے۔"

اسی ایک جگہ آکر وہ اٹک جاتی اور سوچ کے سارے سلسلے بے سمتی کا شکار ہو جاتے۔

وہ سوچتے سوچتے ہار گئی ــــ اب زیادہ وقت بھی نہیں تھا سوچنے کے لئے ــــ اس سچ کو طلوع ہونے سے روکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سوالوں کی آندھیوں میں بھٹکتے بھٹکتے وہ ایک ٹھو نٹھے درخت سے جا لپٹی اور جاوید کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اب ابارشن کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی۔"

"نہیں شمیم نہیں ــــ" جاوید چیخ پڑا تھا۔

"نہیں ــ ہرگز نہیں ــ تم ایسی بات پھر زبان پر نہ لانا۔ نکال دو اس خیال کو اپنے دل و دماغ سے۔ اگر ہمارے جذبے سچے ہیں تو کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا مگر خود اس کے سامنے کوئی صورت نہیں تھی۔

"نہیں جاوید۔ اتنی بڑی حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کی جا سکتی۔ کیا رات کی تاریکی سورج کو طلوع ہونے سے روک سکتی ہے ــــ؟"

"میں جانتا ہوں شمیم ــــ بس کچھ اور صبر کرو۔ مجھے سوچنے دو۔"

صبر کی تلقین کرنے کے باوجود وہ خود سوچ کے دَلدَل میں دھنستا چلا گیا۔

زندگی کا یہ دوراہا کتنا بھیانک تھا اس کے لئے اس کا اندازہ وہی کر سکتا تھا۔ وہ اپنے دل کا بوجھ کس سے کہے ــ؟ کسی دوست احباب سے دل کا یہ راز کہا بھی تو نہیں جا سکتا۔ شمیم کی بدنامی، اس کی اپنی رسوائی، سماجی پوزیشن بگڑنے کا خدشہ ــــ وہ کیا کرے آخر ــ؟

بہت سوچ وچار کے بعد وہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ وہ سب کچھ اب شبانہ سے کہہ دے گا۔ کچھ بھی نہیں چھپائے گا۔ آخر وہی تو اس کی دوست ہے، ساتھی اور غم گسار ہے۔ وہی تو ہے جو آج تک اس کے سارے دکھ درد کو چن چن کر اپنے آنچل میں سمیٹتی آئی ہے۔ ہاں آج وہ سب کچھ کہہ دے گا۔ سب کچھ ـــ جو اس کمزور لمحہ سے شروع ہوتا ہے ـــ جب وہ اور شمیم ـــ

اس فیصلہ سے اسے سکون ملا اور ایسا محسوس ہوا کہ بھٹکے ہوئے راہی کو راستہ مل گیا ہو۔

اس شام، شمیم اپنی سہیلی کے ساتھ پکچر گئی تھی۔ گئی کیا تھی شبانہ نے نے ہی اسے زبردستی بھیجا تھا تاکہ اس کی نامعلوم اداسی کم ہو۔ شبانہ گھر میں تنہا تھی۔ وہ بچوں کی طرح شبانہ کی گود میں سر رکھے تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر ادھورے اور مکمل جملوں میں اس نے ساری بات جوں کی توں بیان کر دی۔ کچھ بھی نہیں چھپایا ـــ اور آخر میں کہا۔

"شبو۔ میں تمہارا گنہ گار ہوں اور تمہیں کسی قیمت پر چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ مگر میں کبھی کبھی بچے کی کلکاریوں کے سامنے کمزور ہو جاتا ہوں میں جس دوراہے پر کھڑا ہوں اس کے دونوں راستے کانٹوں سے بھرے ہیں اور میرے پاؤں کے آبلے میں اتنی سکت نہیں کہ ان کا مقابلہ کر سکوں۔ میں کیا کروں ؟ تم ہی بتاؤ کہ اب کیا کیا جائے ؟ ؟

اس نے سوچا تھا ـــ شبانہ چیخ پڑے گی۔ اس کا منہ نوچ لے گی۔ شمیم کو گھر سے نکال دے گی۔ سارے محلے کو سر پر اٹھالے گی اور سارے زمانے میں اس کی رسوائی ہو جائے گی۔

مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا ـــ وہ شانت رہی، سمندر کی طرح ـــ صرف

چپ چاپ اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ اور جب وہ اس سے نگاہیں چار کرنے کا حوصلہ کھو بیٹھا تو وہ خلاء کی وسعتوں میں کچھ تلاش کرنے لگی۔۔ شاید اس سوال کا جواب جو اس کے پاس نہیں تھا۔۔ مگر جس کی شدید ضرورت تھی۔

شمیم گھر آئی تو شبانہ نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ صرف اس کی طرف بہت غور سے دیکھا۔۔ دیکھتی رہی گویا آج پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ شمیم اس کی تیز نگاہوں سے گھبرا گئی۔ گرچہ اس نے ڈھیلے ڈھالے جمپر میں پیٹ کا ابھار قدرے چھپا رکھا تھا مگر دل میں تو چور تھا۔ جو ہر وقت دل کو دھڑکا تا رہتا تھا۔

وہ رات تینوں کے لئے قیامت سے کم نہ تھی۔ تینوں اپنی اپنی جگہ جاگ رہے تھے۔ تینوں کے نزدیک ایک ہی سوال تھا مگر جواب کسی کو نہیں مل پا رہا تھا۔ وہ تینوں ایک ایسے جنگل میں بھٹک رہے تھے جہاں صرف سوال ہی سوال تھے۔۔ نوکیلے۔۔ کانٹے دار۔۔ جھاڑی دار۔۔۔ ...

کئی دن اسی ٹنشن میں گذر گئے۔ اور اسی درمیان اچانک اسے خریداری کے سلسلہ میں باہر جانا پڑا۔ کام زیادہ تھا اس لئے ہفتہ بھر لگ گیا۔ اس دوران وہ خریداری ضرور کرتا رہا مگر ہر پل اس کے سامنے ایک ہی سوال رہتا تھا جو لاجواب تھا۔

واپسی پر اس کے قدم سو سو من کے ہو رہے تھے۔ اس کا کلیجہ پل پل کانپ رہا تھا کہ نہ جانے اس کی غیر موجودگی میں دونوں بہنوں نے ایک دوسرے سے کیا سلوک کیا ہوگا۔ گھر کے حالات کیسے ہوں گے اور وہ شبانہ سے کس طرح نگاہیں ملا پائے گا۔۔۔

انھیں خیالات میں کھویا ہوا تھکا ہارا وہ اپنی دہلیز تک جا پہنچا۔ اس نے گھنٹی بجائی، اندر آواز گونج اٹھی مگر گھنٹی کی آواز ہتھوڑے کی مانند اس کے دل ودماغ پر برستی ہوئی لگی۔

دروازہ روز کی طرح شمیم ہی نے کھولا مگر وہ اسے دیکھ کر مسکرائی نہیں بس چپ چپ کھوئی کھوئی سی الگ ہٹ گئی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی اجنبی کے گھر میں گھس گیا ہے۔ وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ اس کی نظر شبانہ پر پڑی، وہ دہل گیا۔ مگر خلاف توقع وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور اس کے ہاتھوں سے سوٹ کیس لیتی ہوئی بولی۔

"کیسا رہا آپ کا یہ سفر ــــ؟ اتنے ہی دن میں آپ اتنا کیسے تھک گئے۔ کہیں طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟"

وہ سوال کرتی رہی مگر وہ کچھ بھی نہ بول سکا۔ شبانہ کی یہ تبدیلی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ کھانے کے درمیان بھی شبانہ کرید کرید کر اس سے سفر کی روداد دریافت کرتی رہی اور وہ ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔

جب وہ تینوں کھانا کھا چکے تو شبانہ اٹھ کر کمرے کے اندر گئی اور ایک بڑا سا پیکٹ اٹھا لائی جو لال کاغذ میں لپٹا ربن سے بندھا ہوا تھا بالکل گفٹ پیکٹ کی طرح۔ پیکٹ دیکھ کر اسے بے حد شرمندگی ہوئی۔ ایسے پیکٹ۔ وہ اکثر سفر سے واپسی پر شبانہ کے لئے لایا کرتا تھا۔ جس میں کبھی ساڑی ہوتی، کبھی شال اور کبھی زیور ہوا کرتے تھے اور اتفاق سے اس بار وہ کچھ بھی نہیں لایا تھا۔ وہ انہیں خیالات میں گم تھا کہ شبانہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"میرے سرتاج ــــ شادی کے بعد آپ نے جو پیار اور خوشی مجھے دی ہے اس کا بدلہ میں اپنی جان دے کر بھی نہیں ادا کر سکتی۔ آپ کی اتنی ساری عنایتوں کے عوض میں نے دیا ہی کیا ہے؟ اور پھر ایک تاڑ کے پیڑ

سے سائے کی توقع بھی تو نہیں کی جا سکتی ہے۔" وہ رکی پھر رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"۔۔۔ مگر آج میں آپ کے اتنے سارے احسانوں کے عوض یہ حقیر سا تحفہ پیش کر رہی ہوں۔ خدا کے واسطے اسے ٹھکرا کر میرے یقین کو ٹھیس مت پہنچائیے گا۔۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھیں بھر آئیں اور پیکیٹ اسے تھما کر وہ دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی۔ وہ حیرت زدہ سا رہ گیا۔ شمیم بھی خاموشی سے اس پیکیٹ کو دیکھ رہی تھی اسے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ ساری سچائی کا علم شبانہ کو ہو گیا ہے۔

اس نے پیکیٹ کھولا ۔۔۔ اندر نظر پڑتے ہی دونوں بھونچکے رہ گئے۔ شمیم کا کلیجہ تو اچھل کر حلق میں اٹک گیا ۔۔۔ اندر ایک بہت ہی پیارا سا گڈا پڑا تھا جو اپنے ریشمی ہونٹوں پر پیار بھری مسکان سجائے ہوئے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جس پر شبانہ کی تحریر تھی۔

۔۔۔ میں آپ کے بچے کو اپنی کوکھ سے جنم تو نہیں دے سکتی۔ ہاں اسے ماں بن کر پالوں گی ضرور ۔۔۔ طلاق لینے کے بعد میاں بیوی کے رشتے ضرور ختم ہو جائیں گے مگر میری ممتا ان رشتوں سے کہیں عظیم ہوگی۔ میں نے آپ کی راہوں سے سارے کانٹے چن کر اپنے دامن میں سمیٹ لیے ہیں کیوں کہ زندگی گذارنے کے لئے کچھ تو سہارا چاہئے ۔۔۔ کانٹے ہی سہی ۔۔۔

آپ دونوں کو یہ پھولوں بھری راہ مبارک ہو۔"

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ۔۔۔ اور آن کی آن میں تاڑ کا پیڑ پھیل کر برگد سے بھی زیادہ گھنا ہو گیا جس نے دونوں کو جھلستی ہوئی دھوپ سے کھینچ کر اپنے سائے میں محفوظ کر لیا ۔۔۔"!!

●●
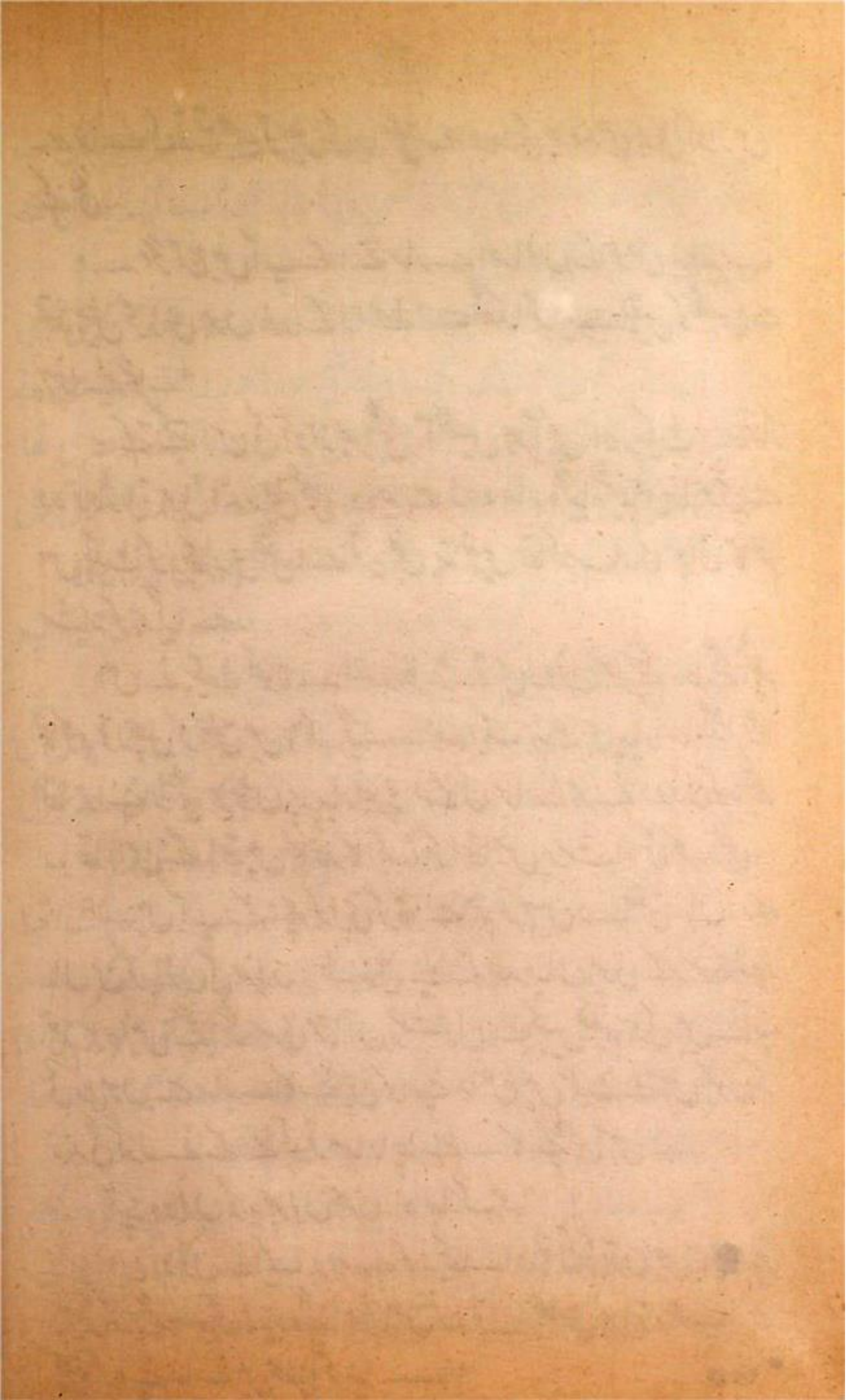
کائیں کائیں

باپ کسی بے انتہا ضروری کام میں مشغول ہے۔ اس کے بغل میں ہی اس کا ننھا سا بیٹا اپنے کھلونے کے ساتھ کھیل رہا ہے بیٹے کی عمر مشکل سے تین سال ہے۔ گھر کی منڈیر پر ایک کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا ہے۔ بیٹا تھوڑی دیر تک کوّے کی طرح دیکھتا ہے پھر اپنے باپ سے سوال کرتا ہے۔

"ابو۔۔ ابو۔۔ وہ کیا ہے۔"

"بیٹا وہ کوّا ہے۔" باپ فوراً ہی جواب دیتا ہے۔

"بیٹا باپ کا جواب سن کر چپ ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی سوال دہراتا ہے۔

"ابو۔ وہ کیا ہے۔؟"

"بیٹا وہ کوا ہے۔ کالا کالا کوا۔"

بیٹا چپ ہو جاتا ہے۔ پھر کبھی کوے اور کبھی باپ کی جانب دیکھتا ہے۔ پھر باپ کا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہتا ہے۔

"ابو ــــ وہ کالا کالا کیا ہے ــــ؟"

باپ بڑے پیار سے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اس کے رخسار کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہتا ہے۔

"بیٹا وہ کالا کوا ہے جو کائیں کائیں کرتا ہے۔"

بیٹا اب بڑے غور سے کوے کی جانب دیکھتا ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس کی تشفی نہیں ہو پائی ہے۔ اس کا جذبۂ تجسس اب بھی تشنہ ہے۔ وہ بار بار ایک ہی سوال دریافت کر کے اپنی پوری تشفی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے پھر وہی سوال دہراتا ہے۔ اسے بار بار پوچھنے میں لطف بھی آرہا ہے۔

"ابو ــــ وہ جو کائیں کائیں کرتا ہے ــــ وہ کیا ہے ــــ؟"

باپ بچے کو اٹھا کر اس کا منہ چوم لیتا ہے اور پھر بہت ہی پیار سے کہتا ہے۔

"بیٹا ــــ وہ کوا ہے۔ جو کالا ہوتا ہے۔ اور کائیں کائیں کرتا ہے۔"

ماں بچہ کی اس حرکت کو بہت دیر سے دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ باپ اپنا ضروری کام چھوڑ کر بچے میں الجھ گیا ہے۔ اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بچے کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بار بار ایک ہی سوال دہرا کر باپ کو کیوں پریشان کر رہا ہے۔ مگر باپ بیوی کو چپ رہنے کی تاکید کرتے ہوئے بہت ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہتا ہے:

"بیگم اسے مت ڈانٹو ــــ اسے سوال کرنے دو۔ یہ اس کے سیکھنے کی عمر

ہے۔ یہ اپنے اردگرد کی ساری چیزوں کو سمجھنا چاہتا ہے۔ بار بار دریافت کر کے اپنے ذہن میں بیٹھانا چاہتا ہے تاکہ دوبارہ کسی اور سے دریافت نہ کرنا پڑے۔"

پھر وہ اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا کر اس سے دریافت کرتا ہے۔

"بیٹا وہ کیا ہے؟" بچہ فوراً جواب دیتا ہے۔

"ابو۔ وہ کوا ہے اور کائیں کائیں کرتا ہے۔"

باپ کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے اور ماں بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔

باپ اور بیٹے کے درمیان سے ایک لمبا عرصہ گذر گیا ہے ——

اب بیٹے نے باپ کی جگہ لے لی ہے جو کب کا ریٹائرڈ ہو چکا ہے۔ باپ کے دل میں بیٹے کی وہی محبت ہے۔ جو آج سے پچیس سال قبل تھی۔

بیٹا دفتر جانے لگتا ہے۔ بہو اسے ٹفن تھما کر بائی بائی کہہ رہی ہے۔ بوڑھا باپ بیٹے کے نزدیک جا کر پیار سے کہتا ہے۔

"بیٹا میری دھوتی جواب دے گئی ہے۔ اس کی شدید ضرورت ہے دفتر سے واپسی پر میرے لئے ایک دھوتی ضرور لیتے آنا۔"

بیٹا باپ کی بات سنتا ہے اور دفتر روانہ ہو جاتا ہے۔ باپ کو یقین ہے کہ آج مشاہرہ ملے گا اور اس کا بیٹا اس کے لئے دھوتی ضرور لائے گا۔ مگر واپسی میں جو پیکٹ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس میں دھوتی کی بجائے رنگین ساڑی نکلتی ہے جسے دیکھ کر بیوی اٹھلا کر کہتی ہے۔

"ڈارلنگ۔ اس کی کیا ضرورت تھی پہلے سے ہی ڈھیر ساری پڑی ہیں۔"

باپ سوچتا ہے۔

"ممکن ہے آج مصروفیت زیادہ ہو گی۔ کل لے آئے گا۔" دوسرے

دن بھی باپ یاد دلاتا ہے۔

"بیٹا کل شاید تم بھول گئے ہوگے۔ آج ضرور لیتے آنا۔ دیکھو نا کئی دنوں سے غسل بھی نہیں کر پایا ہوں۔"

بیٹا دفتر چلا جاتا ہے واپسی میں اس کا ہاتھ خالی ہوتا ہے۔ باپ کے دل میں ذرا بھی میل نہیں آتا۔

"ممکن ہے آج پھر یاد نہ رہا ہو۔ کام بھی تو بہت ہے بے چارے کو۔"

آج تیسرا دن ہے آج بھی باپ بیٹے کو اپنی فرمائش یاد دلاتا ہے۔

"بیٹا۔ آج شرما جی کے یہاں بھی جانا ہے گندی اور پھٹی دھوتی کے کارن نہیں جاسکتا۔ آج بھولنا مت بس معمولی ہی سہی ۔ لے ہی لینا۔"

"یہ کیا کوے کی طرح کائیں کائیں کی رٹ لگا رکھی ہے"

بیٹا باپ کو گھور کر دیکھتا ہے اور ــــــــ

باپ کچھ نہیں کہتا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آجاتا ہے۔ اور پچیس سال پرانا لمحہ اس کی نظروں کے سامنے تھرکنے لگتا ہے۔

"ابو یہ کیا ہے۔؟"

"بیٹا یہ کوا ہے۔"

"ابو۔ وہ کالا کالا کیا ہے۔"

"بیٹا وہ کوا ہے۔ اور کائیں کائیں کرتا ہے۔"

"کائیں۔۔۔ کائیں۔۔۔ کرتا ہے۔۔۔۔۔"

"کائیں۔۔۔ کا۔۔۔ ئیں۔۔۔۔۔"

●●

حصار

فاطمی ۔۔۔ تم ۔۔۔ تم ۔۔۔ اس درجہ پست ذہنیت کے مالک ہو اس کا اندازہ مجھے آج ہوا ہے۔ تم لالچی ہی نہیں فریبی بھی ہو۔ تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ میرے مجروح جذبات کا فائدہ اٹھانے کے لئے مجھ سے محبت کا ناٹک کھیلا۔ آج میں سمجھ پائی ہوں کہ اینلا نے تم سے علیحدگی کیوں اختیار کی۔ تمہاری دولت کی ہوس اینلا کے غریب والدین پوری نہ کر سکے ہوں گے۔ اس لئے تم نے اینلا کو گھر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اور اب تم ۔۔۔ تم مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچا کر اپنی ہوس پوری کرنا چاہتے ہو۔ چھی ۔۔۔۔ فاطمی ۔۔ تمہارا یہ روپ دیکھ کر مجھے تم سے گھن آ رہی ہے۔"

ثریا نے حقارت سے فاطمی کو دیکھا اور اپنا پرس اٹھا کر واپس لوٹنے

کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ثریا۔ ثریا۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ میری مجبوریوں کو تو سمجھو۔ پھر یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ مجھ سے آئندہ کبھی نہ ملنا۔ میری صورت سے بھی نفرت کرنا۔ لیکن جانے سے قبل میری مجبوریوں کی داستان تو سن لو۔"

"کیا سناؤ گے مجھے۔ یہی نا کہ تمہاری بیوی انیلا نے تمہیں تنہا چھوڑ دیا۔ تم قابلِ رحم ہو۔ تمہیں سہارے کی ضرورت ہے۔ نہیں فاطمی صاحب۔ اب میں آپ کی باتوں میں آنے والی نہیں ہے۔" ثریا نے آبدیدہ ہو کر گلوگیر آواز میں کہا۔

"فاطمی تمہیں پیسے چاہئے نا۔۔۔ میں دوں گی تمہیں پیسے۔ تم ان پیسوں سے اپنی جہیز کی بھوک مٹا لینا۔۔ لیکن آئندہ کسی ثریا کے دل سے نہ کھیلنا۔ اور اگر تمہاری ہوس کی بھوک مٹ جائے تو انیلا نے ساتھ اپنا گھر پھر سے آباد کر لینا۔"

"ثریا۔ تم مجھے لالچی سمجھ رہی ہو فریبی قرار دے رہی ہو۔ مکار کہہ رہی ہو۔ اور بھی جو کچھ کہنا چاہو ضرور کہنا۔ لیکن بیٹھو اور سنو میری ان مجبوریوں کی داستان جس کے باعث آج میں تمہاری نظروں میں دنیا کا سب سے گرا ہوا انسان بن گیا ہوں۔" ثریا فاطمی کے اسرار پر بے دلی سے دوبارہ بیٹھ گئی۔ فاطمی چند ثانیئے خلاء میں گھورتا رہا پھر اس نے شکستگی کے عالم کہنا شروع کیا۔

"ثریا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کالج میں لیکچرر مقرر ہوا تھا۔ تب اس نئے کالج کی مالی حالت خستہ تھی یہاں تک کہ شروع شروع میں تنخواہ تک نہیں مل پاتی تھی۔ میرے

سرپرست یعنی میرے چچا کا ہی دم تھا کہ میں اپنا گذر بسر کر پا رہا تھا۔ میرے لئے اس دنیا میں میرے چچا ہی سب کچھ تھے۔ والدین کی محرومی کا احساس اگر مجھے کبھی نہ ہوا تو صرف چچا جان کے باعث۔ انہوں نے مجھے اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا بڑا کیا اور کسی قابل بنایا۔ اگر چچا نے مجھے والدین کی موت کے بعد اپنایا نہ ہوتا تو میں بھی لاوارثوں کی طرح دنیا میں نہ جانے کہاں بھٹک رہا ہوتا۔" وہ رکا پھر ثریا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

جب سے میں لیکچرر مقرر ہوا تھا چچا متواتر مجھ پر زور دے رہے تھے کہ میں شادی کر لوں اور اپنا گھر بسا لوں۔ میں چچا جان کو سمجھایا کرتا۔

"چچا جان ۔۔ آپ تو جانتے ہیں میں برسرِ روزگار ہوتے ہوئے بھی بے روزگار ہوں۔ اس لئے شادی کے بارے میں فی الحال سوچنا مناسب نہیں لگتا ۔۔" مگر چچا بضد رہے۔

انہیں دنوں کی بات ہے میرے چچا کے دوست عظیم الدین صاحب نے بھاگلپور سے انہیں خط لکھا کہ وہ اپنی بیٹی انیلا کی شادی مجھ سے کرنا چاہتے ہیں۔ چچا نے مجھ سے اس خط کا ذکر کیا اور انیلا کو دیکھ لینے کا حکم دیا۔ چچا کے حکم کی تعمیل میں میں محض اتنا ہی کہہ سکا۔

"چچا جان ۔۔ آپ میرے حالات، عادات اور پسند سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے بہتر ہے کہ آپ اور رخسانہ جاکر دیکھ لیں۔"

میری چچا زاد بہن رخسانہ اور چچا جاکر انیلا کو دیکھ آئے۔ عظیم الدین صاحب کی خوش اسلوبی اور خاطر مدارات نے چچا کو مطمئن کر دیا۔ رخسانہ کی کیا مجال جو وہ چچا کی پسند سے اختلاف کرتی۔ چچا نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر کہا۔

"بیٹا ۔۔ عظیم الدین صاحب ایک نیک دل انسان ہیں۔ دولت ان کے

پاس نہیں ہے ۔ البتہ شرافت کے سرمائے سے مالا مال ہیں. قبول صورت لڑکی ہے انہوں نے اسے اونچی تعلیم بھی دلوائی ہے ۔ ایم اے کر چکی ہے ۔ چاہو تو ایک نظر تم بھی دیکھ لو ۔ تاکہ عقد کے فرض کو انجام دے کر میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں ۔ رخسانہ اپنے گھر کی ہو چکی ہے ۔ ایک تمہاری گرہستی آباد ہو جائے تو چین و سکون سے رہ سکوں گا ۔"

"مجھے عظیم الدین صاحب کی دولت یا غربت سے کیا لینا ۔ جب آپ نے انیلا کو پسند کر ہی لیا ہے تو میں دیکھ کر ہی کیا کروں گا ۔"

میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا ۔ اور پھر انیلا سرخ جوڑوں میں میرے یہاں آ گئی ۔

انیلا سے میری پہلی ملاقات ہی جان لیوا ثابت ہوئی ۔ رسومات سے فراغت اور حلقۂ احباب سے فرصت پاتے پاتے رات بھیگ چکی تھی ۔ اس کے بعد میں نے جیسے ہی حجلۂ عروسی میں قدم رکھا، تصورات کا محل چکنا چور ہو گیا ۔ میرے تصور میں گھونگھٹ میں چھپا ایک شرمیلا وجود زندگی کے خوشگوار ترین لمحوں کا بے قراری سے سراپا منتظر تھا مگر یہاں اس کے برعکس انیلا تیوریوں پر بل ڈالے پورے اطمینان کے ساتھ تکیے پر ٹیک لگائے نیم دراز مجھے گھور رہی تھی ۔

"فرصت مل گئی احباب سے ۔" اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ بڑی تلخی سے بولی ۔

"تھوڑی سی تاخیر کرتے تو صبح بھی ہو جاتی ۔"

مجھے انیلا سے اس بے باکی، بے حجابی اور تلخ کلامی کی ہرگز توقع نہ تھی ۔ اس کے الفاظ تیر کی انی کی طرح میرے دل میں پیوست ہو گئے ۔ اس مخصوص

رات کے لئے دل میں بسائے تمام ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ تمام مکالمے جو تصورات سے چرا کر محفوظ کئے تھے زبان پر آنے سے پہلے ہی دل میں گھٹ کر رہ گئے۔

اینلا جو دلہن کم ٹیچر زیادہ لگتی تھی منہ پھیر کر بستر پر دراز ہو گئی۔ اسے بھی ایک ادا مان کر میں آگے بڑھا اور بولا۔

"ابھی تو رات جوان ہوئی ہے بیگم۔ ہم خواہ مخواہ اس کی جوانی کو بے کار باتوں سے داغ دار کیوں کریں۔"

"یہ شاعری، یہ لفاظی اور یہ کتابی باتیں، کان کھول کر سن لو، مجھے پسند نہیں۔"

وہ پھٹ پڑی اور میں مبہوت اپنے شکستہ شیش محل کی کرچیاں سمیٹتا رہ گیا۔ اس رات کی جزئیات نگاری سے کیا فائدہ۔ قصہ مختصر یہ کہ بہار آنے سے قبل ہی خزاں نے میرے نشیمن پر یلغار کر دیا تھا

صورت تو خیر قدرت کی بنائی ہوئی ہوا کرتی ہے مگر انسان اپنی سیرت سے ہر صورت قابلِ توجہ بنا سکتا ہے مگر اینلا کا معاملہ الگ تھا ایک تو کریلا اور پر سے نیم چڑھا۔ گوشت سے عاری گندمی سی گہری رنگت، کا بے ترتیب ڈھانچہ اس پر صورت بھی ایسی کہ جذبات کے دہکتے ہوئے سارے انگارے آپ ہی آپ سرد ہو جائیں — لیکن — قصور تو میرا ہی تھا۔ مجھے چچا جان کا کہنا مان کر اینلا کو ایک نظر دیکھ لینا چاہیئے تھا۔ اگر دیکھ لیتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی کیونکہ میں لاکھ بد ذوق سہی مگر اتنا بھی پست ذوق نہ تھا کہ اینلا کو پسند کر لیتا۔ مگر اب دوش کسے دیتا، جو ہوا بہتر ہوا مان کر صبر کر لیا۔ اور زندگی کی اس کجروی کو برداشت کر لیا کہ دکھ اٹھانے کی پرانی عادت ہے مجھے۔"

فاطمی کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ بوجھل لمحوں پر خاموشی مسلط ہوئی تو ثریا بولی۔

"چنانچہ محض اینلا کی صورت پسند نہیں اور فاطمی صاحب آپ نے اسے اپنی زندگی سے علیحدہ کرنے میں دیر نہ کی۔"

"نہیں ثریا نہیں ــ میں یہ سوچ کر کہ اینلا احساس کمتری کے باعث چڑچڑے مزاج کی ہو گئی ہے اگر اینلا کے کامپلکس کو اپنی محبت سے ختم کر دوں تو یہی اینلا زندگی میں بہار بن سکتی ہے۔ اسی جذبے کے تحت میں اینلا کی ناز برداریاں کرنے لگا۔ کبھی کبھی میرے اس برتاؤ پر رخسانہ نے مجھے چھیڑا بھی مگر میں رخسانہ کی بات گول کر گیا۔ ہفتہ میں ایک دن کے لئے رخسانہ کا گھر آنا اینلا کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر رخسانہ کو کھری کھوٹی سنانے سے باز نہ آتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رخسانہ نے چچا کی موت کے بعد مجھ سے ترک تعلق کر لیا۔ اب تو بے چاری دوسروں کی زبانی ہی خیر خیریت معلوم کر لیتی ہے۔ جب کبھی میں اس سے ملنے جاتا ہوں اینلا برانگیختہ ہو اٹھتی ہے۔

میں بھی ایک انسان ہوں۔ میرے بھی سینے میں حسیات کا گہوارہ دل دھڑکتا ہے۔ کبھی کبھی صبر کا دامن چھوٹ جاتا اور جھگڑے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ اینلا کے والدین اعزہ و اقارب کے ساتھ مجھے قصور وار ٹھہرا کر غلطیاں گنواتے اور صلح صفائی کروا کر چلے جاتے۔

باپ کے ناطے بیٹی کی حمایت ایک حد تک جائز بھی ہے لیکن عظیم الدین صاحب کا رویہ ہی عجیب تھا۔ وہ مجھے ہی دھمکی دیتے ــ ایک بار تو مجھے برباد کر کے فٹ پاتھ پر بھیک منگوانے کی بھی دھمکی دے گئے۔ اور محلے والوں میں انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ فاطمی میری بچی کو صرف اس لئے تنگ کرتا ہے

کہ میں نے اسے خاطر خواہ جہیز نہیں دیا ہے۔

ان کی اس گھٹیا حرکت کی خبر جب مجھے ملی تو میں نے انیلا کی کھری کھوٹی کا جواب دینا ہی ترک کر دیا۔ اسے شہ مل رہی تھی اور میں اپنا زیادہ تر وقت گھر سے باہر کالج یا لائبریری میں گذارا کرتا تھا۔ گھر کا خیال دل میں آتے ہی ذہن میں تلخی بھر جاتی اور زندگی سے دور بھاگنے کو جی چاہنے لگتا۔

اس کرب کو سہتے ایک برس گذر گیا۔ ان ۳۶۵ دنوں کے قافلے میں چند روز بھی خوشی بختی کی نوید لے کر آئے ہوتے تو میں اتنا لوٹ نہ جاتا کہ اپنی بیوی کے حق میں حصہ بانٹتا۔"

"تمہاری مراد مجھ سے ہے؟" ثریا نے برا ماننے کے انداز میں کہا۔

"ہاں ثریا۔ میری اس بے کیف زندگی میں تم آئیں اور میں نے تم سے ایک دوست کی دوستی حاصل کی۔ تمہارا کالج میں تقرر، اور پھر مجھ سے میل جول میرا سہارا بن گیا۔ ممکن ہے تمہیں میری حالت پر ترس آیا ہوگا۔ آج سے قبل میں نے کھل کر کبھی اپنے دل کا حال تمہیں نہیں بتایا۔ تم تو صرف اتنا ہی جانتی تھیں کہ میں ان بدقسمتوں میں سے ایک ہوں جن کی ازدواجی زندگی میں پھولوں کی جگہ کانٹے بچھے ہوتے ہیں۔ مجھے تم سے اور تمہیں مجھ سے انسیت ہوتی گئی اور ہم دونوں جو اپنی زندگی میں خلاء محسوس کرتے تھے ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ ہمارے تعلقات میں اضافہ لوگوں کو برداشت نہ ہوا اور طرح طرح کی افواہیں اڑائی گئیں جس کی گواہ خود تم ہو۔ جب ان باتوں کا علم انیلا کو ہوا تو لڑ جھگڑ کر اپنے گھر جا بیٹھی اور عظیم الدین صاحب نے میرے گھر آکر وہ سب کچھ کہا جو انہیں نہیں کہنا چاہئے تھا۔ میں نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کیا اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تم میری

محض ایک دوست اور غم خوار ہو اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ لیکن انہوں نے میری ایک بھی نہ سنی اور مجھ سے نپٹ لینے کی دھونس دے کر چلے گئے۔

میں نے اگلے روز کالج میں تمہیں صرف یہی بتایا کہ انیلا ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔ اس ڈر سے کہ تم بھی مجھ سے ترک تعلق نہ کر لو میں نے تم سے دانستہ یہ نہیں بتایا کہ تمہاری وجہ سے انیلا نے گھر چھوڑا ہے۔ تم نے مجھے صبر سے کام لینے کی تلقین تب بھی کی جب انیلا کے گھر والوں نے مجھ سے طلاق طلب کی۔ شروع میں میں ان کے اس عمل کو ان کی بے وقوفی اور وقتی غصہ کا نام دیتا رہا اور معاملہ کو طول دیتا رہا۔ میرا ارادہ انیلا سے ترک تعلق کرنے کا ہرگز نہیں تھا۔ عظیم صاحب باپ ہو کر بھی بیٹی کا گھر اُجاڑنے پر آمادہ تھے۔ اور پھر حالات کی ستم ظریفی میں گھر کر میں نے انیلا کو واپس گھر بلانے کی کوشش ترک کر دی اور تمہاری طرف کھنچتا چلا گیا۔ تمہاری قربت میں مجھے نہ صرف ذہنی سکون ملتا بلکہ میرا بکھرا وجود بھی تمہارے پاس آکر سمٹ جاتا۔

تم نے مجھے بکھرنے سے بچا لیا ثریا۔۔ اور تمہارے احسان کو تمہارے فرض میں تبدیل کرنے کے باعث غور کرنے لگا اور بہت سوچنے سمجھنے کے بعد ہی تم سے شادی کی بات کی۔" وہ خاموش ہوا ہی تھا کہ ثریا نے بات اچک لی۔

"اور جب میرے سوئے ہوئے ارمان ہرے ہو گئے۔ میں جو شادی کی امید کھو چکی تھی، جب دلہن بننے کا خواب دیکھنے لگی تو تم نے لگے ہاتھوں اپنی وہ حسرتیں بھی پوری کرنا چاہیں جن سے عظیم الدین صاحب نے تمہیں محروم رکھا تھا۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم مجھ سے سچ مچ محبت کرتے ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہیں سہارے کی ضرورت ہے۔ اب میں تمہاری زندگی سے ہی نہیں، اس کالج اس شہر سے بھی دور چلی جاؤں گی۔"

"نہیں ثریا۔۔ ابھی تم نے پوری بات نہیں سنی۔"

"اب اس سے آگے مجھے سننے کی ضرورت نہیں کیونکہ آگے کا حال تم مجھ پر آشکار کر چکے ہو۔ سیدھے لفظوں میں تم سے یہ نہیں کہا گیا کہ تم مجھ سے پچیس ہزار روپے شادی ٹیکس حاصل کرنے کے بعد ہی مجھے اپنا سکو گے جو میرے پاس نہیں ہیں اور اگر ہوتے بھی تو شاید میں نہ دیتی۔"

"میں نے تم سے یہ تو نہیں کہا ثریا ـــ ؟" فاطمی بہت ہی دکھ کے ساتھ بولا۔

"پھر میں تمہاری اس بات کا کیا مطلب نکالوں جو تم نے مجھ سے آج کہی۔ یہ جملہ تمہارے اور میرے پیار پر تلوار کی وار بن کر چلا اور اس رشتہ کو کاٹ گیا جس کی تمنا میرے دل میں جاگ اٹھی تھی۔ تمہیں نے تو کہا تھا کہ ثریا ۲۵ ہزار روپے کا انتظام کئے بغیر ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں نہیں ہو سکتی۔۔۔ ہرگز نہیں ہو سکتی۔" فاطمی بھی جوش میں آ گیا اور قدرے تلخ اور بلند آواز میں بولا۔

"تم مجھ سے دور جانا چاہتی ہو تو شوق سے جاؤ ثریا۔ میں بغیر کسی سہارے کے بھی زندہ رہ لوں گا۔ مگر جاتے وقت اتنا بڑا الزام مجھ پر نہ دھرو۔ یہ ۲۵ ہزار روپے میں نے تم سے مانگے نہیں بلکہ میں اپنا جان کر تم پر اپنی مجبوری ظاہر کی تھی۔"

"کیا ہے وہ مجبوری ـــ ذرا میں بھی تو سنوں۔" ثریا نے سرد مہری سے کہا۔

فاطمی چند ثانیئے خاموش رہا پھر بھاری لہجے میں بولا۔

"میرا تم سے شادی کا ارادہ عظیم الدین صاحب کے کانوں تک بھی پہنچ چکا ہے۔ اس کے جواب میں وہ کل میرے پاس آئے تھے۔ مجھے وارننگ

دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔"

"فاطمی میاں۔ میری بیٹی کا کچھ نہیں بگڑنے والا ہے۔ تم اپنی سی کوشش کئے جاؤ۔ وہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی ہے اس کا گذر تم جیسے دقیانوسی آدمی کے ساتھ ہو بھی نہیں سکتا۔ تم دوسری شادی رچانے سے قبل اپنے اس قول کو پورا کرو۔ جو تم نے پہلی شادی کرتے وقت بھرے مجمع میں کیا تھا۔ اس قرض کو ادا کرو جو واجب الادا ہے۔ مہر کی پوری رقم ۲۵ ہزار اگر میں نے یک مشت وصول نہیں کیا تو میرا نام بھی عظیم الدین نہیں۔"

"ثریا۔ یہ ہے میری مجبوری۔ میں نے تم سے اس قرض کو ادا کرنے کے لئے نہیں کہا ہے نہ میری خودداری یہ گوارہ کرے گی میں تم سے جہیز لے کر شادی کروں۔" وہ چپ ہو گیا پھر بے حد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"مہر کا کیا تصور تھا۔ اور لوگ اسے کس روپ میں استعمال کر رہے ہیں۔ میں مہر کے حصار میں قید ہوں ثریا۔ اس سے رہائی کی صورت بھی مجھے ہی کرنی ہے اور۔"

فاطمی کی بات ادھوری رہ گئی۔ آنکھوں کے سرخ ڈورے پگھلنے لگے اور پلکوں پر سجے خواب آنسوؤں کے ہمراہ بہہ گئے۔ اس سے قبل کہ وہ موتی بکھر کر ٹوٹتے ثریا نے اسے اپنے آنچل میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

"فاطمی ڈیر۔ مجھے معاف کرنا۔ میں جذبات میں بہہ گئی تھی۔"

پھر وہ فاطمی کا جھکا چہرہ اٹھا کر اس کی سرخ آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔

"میرے دوست۔ میں انتظار کروں گی۔ چاہے یہ انتظار عمر بھر کا ہی کیوں نہ ہو۔"

●●

سوکن

"جلدی کرو ڈارلنگ دس بج رہا ہے۔"

"یہ لیجئے۔" شاداں نے کوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے جلدی سے اپنا کوٹ پہنا اور ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے باہر نکلا پھر فوراً ہی اندر چلا آیا۔

"اب کیا رہ گیا ہے ــــ؟" شاداں نے دریافت کیا۔

"تم بھی عجیب ہو۔ ایسا بھی نہیں ہوتا کہ جو چیز چھوٹ جائے یاد دلا دو۔" اس کے لہجے میں قدرے جھلاہٹ تھی۔

"آخر کون سی چیز رہ گئی ــــ؟"

"اصل چیز ہی میں چھوڑے جا رہا تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے شاداں کے سرخ و تاباں ہونٹوں کو چوم لیا اور اس کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"اگر میں بھول جاؤں تو یاد دلا دیا کرنا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا اور شاداں ایک قیامت خیز انگڑائی لیتی ہوئی پلنگ پر گر پڑی۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا اس سے بھی بہتر زندگی کی تمنا کی جا سکتی ہے۔ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی شوہر پیار دے سکتا ہے۔ اس وقت وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت تصور کرنے لگی اور ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی۔

یہ شادی شاداں کی اپنی پسند کی تھی اور اس کے لئے اسے بہت بڑی قربانی دینی پڑی تھی۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی شاداں کو اس کے باپ نے کہا تھا۔

"دیکھو بیٹی۔ جذبات میں آ کر اتنا بڑا فیصلہ نہ کرو۔ پیار کا نشہ تو چند دنوں میں اتر جائے گا مگر دنیاوی ضرورتیں آخری سانس تک باقی رہیں گی۔"

لیکن شاداں کا ایک ہی فیصلہ تھا۔ جو اس کا پہلا اور آخری تھا۔

"میں جاوید کے لئے ساری دنیا چھوڑ سکتی ہوں۔"

ایک تو جوانی کی عمر ہی پاگل پن کی ہوتی ہے دوسرے پیار کا نشہ، بھلا ایسے میں کوئی کیا پرواہ کرے گا۔ حالانکہ شاداں کو جاوید نے بھی بہت سنجیدگی سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"شاداں۔۔ تمہارے پاپا درست ہی کہتے ہیں۔ ایک بے کار آدمی دو وقت کی روٹی کی فکر میں پیار دینا بھی بھول سکتا ہے۔"

جاوید کی باتیں بھی شاداں کے قدم نہ روک سکیں۔ اس نے بہت تاسف

سے کہا تھا۔

"میں سنا کرتی تھی کہ والدین بچوں کی خوشی کے لئے اپنی جانیں تک قربان کردیتے ہیں مگر۔۔۔۔۔"

پھر اس نے جاوید کے کندھوں پر سر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"جادی ۔تم تو ساتھ نہیں چھوڑو گے۔؟"

جاوید ایک گریجویٹ تھا ایک متوسط طبقہ کا فرد۔ خوش قسمتی بس اتنی ہی تھی کہ اس کے کندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ نہ تھا۔ شاداں سے شادی کے بعد اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ شاداں کو وہی خوشی دینا چاہتا تھا جو اس سے چھوٹ گئی تھی۔ اس نے بہت سے مقابلوں کا امتحان دیا مگر نتیجہ وہی صفر رہا۔ تھک ہار کر اس نے ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرلی۔ اس کی دن رات کی کاوشیں رنگ لائیں اس کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے اسے اسسٹنٹ منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور رہنے کے لئے دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ بھی مل گیا۔

اب جاوید کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شاداں کو اس کی کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ حالانکہ شاداں نے مصیبت کی گھڑی میں بھی اس کا ساتھ دیا تھا اس نے کبھی بھی زبان پر حرفِ شکایت نہیں لایا۔ جاوید شاداں کو حد سے زائد پیار کرتا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شاداں نے جس پیار کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑا ہے اس میں ذرہ برابر بھی کمی کی جائے۔ وہ ہمیشہ شاداں کو اسم بامسمیٰ دیکھنا چاہتا تھا اور یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا کہ وہ جب بھی آفس جانے لگتا اس کے ہونٹوں کو چومنا نہ بھولتا۔ شادی کے بعد شاید ہی کوئی ایسا دن گذرا ہو جب اس کے معمول میں

فرق آیا ہو۔

دفتر سے واپسی پر شاداں اپنے ہونٹوں پر انتظار کی مسکراہٹ سجائے اس کی راہ تک رہی ہوتی اور وہ اس کی زلفوں کو بکھیرتا ہوا اس کی خیریت دریافت کرتا۔ دونوں کی زندگی بہت ہی مطمئن اور پُرسکون تھی۔ ایک دوسرے کے پیار میں گم، دو سال کا وقفہ گذر گیا مگر انہیں وقت گذرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ شاداں جاوید کے پیار کی دیوانی، جہاں گھڑی نو بجنے کا اعلان کرتی اس کے ہونٹوں میں عجیب سی گدگدی ہونے لگتی۔ اس کا چہرہ گلنار ہو جاتا وہ کس لذت آمیز کیفیت سے دوچار ہوتی، اس کا اندازہ اسے خود بھی نہیں تھا۔ اور جیوں ہی جاوید کے گرم گرم ہونٹ اس کے ہونٹوں کو چومتے وہ شرسار سی ہو جاتی ایسا محسوس ہوتا جیسے دنیا کی ساری مستی اسی میں سما گئی ہو۔ وہ متوالی سی ہو جاتی اور جاوید کے جانے کے بعد نہ جانے کتنی بار اپنی زبان نکال کر اپنے ہونٹوں پر پھیرتی۔ پتہ نہیں وہ جاوید کے ہونٹوں کے لمس کو محسوس کرنا چاہتی تھی یا ان ہونٹوں کی مٹھاس کا اندازہ لگانا چاہتی تھی جسے جاوید دنیا کی شیریں ترین شئے تصور کرتا تھا۔

کتنی بار ایسا بھی ہوا کہ جاوید اس کے ہونٹوں کو چومے بغیر ہی چلا گیا۔ وہ مارے شرم کے گڑ جاتی اسے بھلا یاد بھی کیسے دلاتی۔ یہ سوچ کر ہی اس کے رخسار شہابی ہو جاتے مگر جاوید ــــ وہ بھی کم نہ تھا۔ آدھے راستے سے بھی لوٹ آتا اور بڑی شرارت سے کہتا۔

"کیوں ری ــــ اگر یاد ہی دلا دو تو کون سی قیامت آجائے گی۔"

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ جاوید بہت جلدی میں تھا۔ وہ شاداں کو پیار کئے بغیر ہی چلا گیا۔ ایک ضروری میٹنگ میں شریک ہونا تھا۔ شاداں

سوچتی رہی کہ اب آتا ہی ہوگا وہ بھلا یونہی کیسے جا سکتا تھا۔ مگر گھنٹہ بھر بعد بھی وہ نہ آیا تو اس کے ہونٹوں کی گدگدی نے اسے بے حال کر دیا۔ غصہ میں اس نے اسے مسل مسل دیا مگر وہ جان لیوا احساس کم نہ ہوا۔ اس کی نگاہیں اب بھی دروازے کی طرف تھیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔

"ٹرن ... ٹرن .... ٹرن ...."

فون کی گھنٹی تقریباً دو گھنٹہ بعد بجی اور وہ دوڑتی ہوئی فون والے کمرے میں چلی گئی۔ جیسے جاوید آگیا ہو۔ فون کان میں لگاتے ہی اس کے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"شاداں ——!" جاوید کی آواز اس کے پورے وجود پر چھا گئی۔

"ہوں —"

"اپنے —— ارے نہیں میرے ہونٹوں کو ذرا قریب تو لاؤ۔"

اور لاشعوری طور پر شاداں نے اپنے ہونٹوں کو ماؤتھ پیس کے قریب کر دیا۔ اتنا قریب کہ اس کی سانسوں کی آواز جاوید سن رہا تھا۔ پھر وہ اس وقت چونکی جب فون پر جاوید کے بوسہ لینے کی آواز آئی۔ وہ اس طرح شرما گئی جیسے کسی نے اسے قریب سے دیکھ لیا ہو۔

یہ اس کا ساتواں مہینہ چل رہا تھا۔ جاوید اس پر بہت دھیان دینے لگا تھا۔ اس کے قدم ذرا بھی تیز اٹھ جاتے تو وہ بڑی بوڑھیوں کے انداز میں کہتا۔

"اے لڑکی ذرا سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا۔ اب تمہارے دھما چوکڑی کرنے کے دن نہیں رہے۔"

شاداں اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیتی اور آنکھیں بند کر لیتی۔

پندرہ روز قبل ہی اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اکیلے جاوید کے لئے مسئلہ تھا۔ وہاں نرسیں اور ڈاکٹر موجود تھیں اس طرح اسے پریشان سے نجات مل گئی تھی اور وہ مطمئن تھا۔ آفس کے بعد کا سارا وقت وہ اسپتال میں ہی گذارتا تھا۔

اور وہ دن بھی آ ہی گیا جب ایک مخلوق نے خالق کے درجہ کو پانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ شاداں کے بغل میں پالنے پر پھولوں سے نرم ونازک گالوں والی لڑکی ہمک رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی جاوید نے اس کے نرم ونازک رخسار کو چوم لیا تھا۔

پورے ایک ماہ بعد اسپتال میں رہنے کے بعد شاداں اپنے کوارٹر میں آگئی تھی۔ بچی دونوں کی نظروں کا مرکز تھی اور دونوں اپنے وجود کو بھول کر اس ننھی سی جان میں گم تھے۔

”ٹن۔۔ ٹن۔۔۔ ٹن۔۔“

دیوار گھڑی نے نو بجنے کا اعلان کیا اور جاوید جلدی سے اٹھ گیا۔ اسے آفس جانے کی تیاری کرنی تھی۔ گھڑی کے ٹن ٹن نے شاداں کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں میں پھر وہی مخصوص سی گدگدی ہونے لگی جیسے وہ پورے ایک ماہ سے بھولی ہوئی تھی۔ دیوار گھڑی جیسے ہی نو بجنے کا اعلان کرتی اس کے ساتھ ہی اس کے بدن میں چھپا ہوا کوئی خفیہ سوئچ آن ہو جاتا اور گدگدی کی ترنگیں اس کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگتیں اور اسے بے حال کر دیتیں۔ آج بھی وہی ہوا۔ وہ پھر اسی لذت آمیز کیفیت سے دوچار تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ اس کی گدگدی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور جب یہ کیفیت حد سے سوا ہو گئی تو وہ متوالی سی ہو کر بچی

کے رخسار پر اپنے ہونٹ رگڑنے لگی۔ بچی اس طرح اچانک پیار کئے جانے سے گھبرا کر رونے لگی مگر شاداں اس کی پرواہ کئے بغیر اسے اچھالتی ہوئی اپنے سینے سے بھینچتے ہوئے چومتی رہی۔ جاوید تیار ہو کر مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اس کی گدگداہٹ ناقابل برداشت ہو گئی۔ اس کی سانسیں کافی تیز چلنے لگیں اور پورے جسم کا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا۔ آنکھوں میں لالی تیر گئی اور پلکیں بوجھل ہو گئیں۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ بچی اس کی باہوں میں تھی مگر پھر بھی اس کے ذہن میں بچی کا تصور تک نہیں تھا۔ وہاں تو صرف اس مخصوص گدگدی کا قبضہ تھا جو اب اس کے پورے وجود میں پھیل گئی تھی۔

جوں ہی جاوید اس کی طرف جھکا اور اس کے ہاتھ اس کی زلفوں سے الجھے، شاداں کی آنکھیں آپ سے آپ بند ہو گئیں۔ ہونٹ بے تحاشہ کپکپانے لگے ان پر نمی چھلکنے لگی۔ جاوید کی سانسوں کی گرمی اپنے رخسار پر محسوس کرتے ہی لمحہ بھر کو اس کے دل کی دھڑکن رک سی گئی اور پھر اسے جاوید کے بوسہ لینے کی آواز آئی اور وہ چونک پڑی۔

جاوید کے ہونٹ شاداں کے ہونٹوں کو چومنے کے بجائے بچی کے رخسار پر چوم چکے تھے۔ اچانک اس کا پورا وجود تلخیوں میں ڈوب گیا۔ اس نے بچی کی طرف دیکھا اور ایک لمحہ کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بچی جسے وہ ابھی ابھی بے تحاشہ پیار کر رہی تھی۔ ان کے پیار کی امانت نہ ہو بلکہ اس کی سوکن ہو۔۔۔!

●●

کسی زمانے میں ایک راجہ ہوا کرتا تھا۔
اس کی سات رانیاں تھیں۔
نہیں، رانیاں تو کئی ایک تھیں — اس کی سات شہزادیاں تھیں اور .... اور ....
نہیں .. نہیں ... یہ اس زمانے کی بات نہیں ہے — وہ زمانہ اب کہاں رہا، جب راجہ اور رانی کی کہانی سنائی جائے — یہ کہانی اس زمانے کی ہے — راجہ کی نہیں، بلکہ ایک سپاہی کی۔
ہاں تو کسی زمانے میں ایک سپاہی ہوا کرتا تھا۔ جس کا کام صاحب بہادر کی سلامی بجالانا تھا۔ اور اس حکم کے غلام کی دو ٹکے کی نوکری تھی مگر

اس کے خواب لاکھوں کے تھے۔ وہ صاحب بہادر کی باغ و بہار زندگی کو دیکھا کرتا اور پھر اپنی خزاں رسیدہ زندگی کو ــــ

وہ اکثر کھلی آنکھوں سے سپنے دیکھا کرتا ــــ کہ وہ صاحب بہادر بنا پھر رہا ہے اور بہت سے دو ٹکے کی نوکری والے حکم کے غلام اس کے ارد گرد اس کی ہر بات کو مقدس بول کی طرح اپنے دلوں میں اتار لینے کے لئے بے چین کھڑے ہیں۔ پھر اسے راہ چلتے ٹھوکر لگتی اور اس کے سپنوں کا محل اس کی کھلی آنکھوں سے پھسل پڑتا... راہ کے پتھر پر گرتے ہی سپنے چکنا چور ہو جاتے اور اس کی ساری کرچیاں اس کی آنکھوں میں کھب جاتیں اور پھر وہ اپنی آنکھوں کو نہ تو کھلی رکھ پاتا اور نہ ہی بند ــــ

ایسا حادثہ ــــ سپنوں کے محل کے گر کر چور چور ہونے کا ــــ بارہا ہو چکا تھا ــــ مگر وہ اپنی عادت سے مجبور تھا اور سپنے دیکھنا اس کی کمزوری تھی ــــ

اپنے سپنوں کو حقیقت میں بدلنے کے لئے اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کا نام میجر رکھ دیا۔ سوچا باپ سپاہی ہے تو بیٹا کم از کم میجر تو ضرور ہی ہوگا! اس کا لڑکا باپ کی طرح صرف خواب دیکھنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ ہر صورت میں ان خوابوں میں رنگ بھرنا چاہتا تھا جسے اس کا سپاہی باپ اپنی پلکوں پر سنبھال کر نہیں رکھ پا رہا تھا۔ باپ نے اپنے خوابوں کی تعبیر اپنے اکلوتے بیٹے کی عیار آنکھوں میں دیکھ لی تھی۔ اس لئے اب اس نے اپنا پیٹ کاٹنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ بھرنا شروع کر دیا۔

باپ کے آدھے پیٹ کی کمائی کام میں آئی اور میجر بیٹا ایم، اے ہو گیا۔ باپ بیٹے کی صلاحیت سے واقف تھا۔ مگر اسے اس کی صلاحیت پر کم از

کی عیاری پر زیادہ بھروسہ تھا۔ پھر باپ نے صاحب بہادر کی جی حضوری کی، بار بار حاضری دی، اور بیٹے کو کالج کے لیکچرر کی گدی پر بیٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔

بیٹا لیکچرر ہو کر اب پروفیسر کہلانے لگا — یہ اس کی پہلی کامیابی تھی۔

پچاس روپے ماہانہ کی آمدنی سے سپنوں کے محل میں رنگ نہیں بھرا جاسکتا تھا۔ کامیابی کی اس پہلی منزل پر وہ مضبوطی سے کھڑا رہا اور اگلی منزل کے لئے کوشش کرنے لگا۔

یہ وہ دور تھا جب زمانے نے کروٹ لی تھی، اور غلامی کی زنجیریں کٹ چکی تھیں۔ آزادی کا شور چاروں طرف برپا تھا۔ میجر نے ایک چیت لگائی اور خود کو آزادی کے سورما میں شامل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ لوگ جنھوں نے آزادی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی۔ اپنے سکھ چین کا بلیدان دیا تھا۔ بال بچوں کی فکر کو دل سے نکال دیا تھا۔ اور ہر اس شے کی قربانی کرنے سے گریز نہیں کیا تھا۔ جس کی آزادی کو ضرورت تھی — ان لوگوں نے اس رنگے سیار کو پہچان لیا۔ اور اپنی بھیڑ سے اسے نکال دیا۔

تب اس رنگے سیار نے دوسری چال چلی اور لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا۔

"تم سب ڈھونگی ہو، آزادی کی رٹ لگاتے ہو۔ مگر تم آزادی کے معنی نہیں جانتے۔

اس آزادی کی قدر کیا ہوگی جو تمہیں بھیک میں ملی ہو۔ اگر تم نے خون دے کر آزادی حاصل کی ہوتی تب تمہیں محسوس ہوتا کہ آزادی پانے کا

نشہ کیسا ہوتا ہے۔"

سرِ راہ لوگوں نے اس کی بات سنی اور اسے پاگل کی بڑ سمجھ کر آگے گذر گئے۔

میجر کو باپ کے خوابوں میں رنگ بھرنا تھا۔ باپ اپنے ارمانوں کو اپنے خوابوں کو اپنے ساتھ لئے منوں مٹی کے تلے دبا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کے ساتھ تھیں مگر اس میں سجے سپنوں کا عکس باہر ہی رہ گیا تھا تاکہ میجر اس میں رنگ بھر سکے۔ وہ اب زندگی کی دوڑ میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ وہ ہر قیمت پر اپنے ان خوابوں کی تعبیر چاہتا تھا، جو اسے اپنے باپ سے وراثت میں ملے تھے۔ پھر اچانک ایک انقلاب آیا اور میجر کی زندگی میں رنگ بھر گیا۔

ہوا یوں کہ پہاڑ کی نگری میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ یہ پہاڑی کا نگر بھی خوب تھا۔ اس کی برگدوں کی چھاؤں میں رشی منیوں نے نروان تلاش کئے تھے اور مورخوں نے نروان کی ان کہانیوں کو تاریخ کے اوراق میں سمیٹ لیا تھا۔ پتھر کی اس نگری میں جہاں سورج کی تپش پتھروں کو پگھلا دیتی تھی۔ خوب اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ ان میں ایک پہاڑ ان سب کا مسیحا تھا اور آڑے وقت ان کے کام آتا تھا۔ وہ ان کی مسیحائی میں یوں مشغول ہو گیا کہ اپنے ارد گرد کی اسے خبر ہی نہ رہی۔ پانی کے میٹھے چشموں کو اس نے پہاڑی کے درمیان خوب بلندی پر اکٹھا کر رکھا تھا۔ سوچا تھا کہ ایک دن کسی اجنبی پہاڑ کو یہ قیمتی امانت سونپ دے گا، مگر وہ چشمہ ابل پڑا۔ سورج کی تپش نے اس کے ابال میں اضافہ کر دیا۔ اور اس چشمہ نے ایک جھرنے کی شکل اختیار کر لی اور پہاڑ کی بلندی سے بستی کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔

فراز سے نشیب کا یہ سفر اچانک ہی شروع ہو گیا تھا۔ ارد گرد کے

پہاڑ دنگ رہ گئے۔ اور بیچارہ مسیحا، زندگی بھر دوسروں کی مسیحائی کرتا رہا تھا۔ آج اپنے ہی زخموں سے وہ چور تھا اس کی مسیحائی کے لئے کوئی سامنے نہیں آ رہا تھا۔

اب اس جھرنے نے ندی کی شکل اختیار کر لیا۔ پہاڑی ندی کا بہاؤ جتنا تیز ہوتا ہے اس کا کٹاو بھی اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ وہ ندی جوانی کے جوش میں مستی بھری چال سے اٹھلاتی اور بل کھاتی ہوئی گھاٹ گھاٹ کا سفر کرنے لگی۔ اور مسیحا اس کے روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے لگا۔ اسے ایک ایسے پتھر کی تلاش تھی جو نشیب میں پڑا ہو اور فراز سے آتی ہوئی اس طوفانی ندی کو نیچے ہی روک لے اور اپنی آغوش میں سمالے۔

میجر ایک عرصہ سے نشیب میں پڑا، فراز کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھا تھا اس نے بھی اس ندی کو اوپر سے نیچے آتے دیکھا اور موقع غنیمت جان کر اپنی باہیں پھیلا دیں ——

ندی کے لئے میجر کا لمس یا اس کی آغوش نئی نہیں تھی۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا سفر کر چکی تھی۔ اسے وہ ساری راہیں زبانی یاد تھیں جن پر میجر اب اسے سفر کرانا چاہتا تھا۔ وہ تیز رفتار اور طوفانی تھی اور اپنی اس تیز گامی سے وہ قدرے تھک بھی گئی تھی۔ اس لئے اب اسے بھی ایک مستقل گھاٹ کی تلاش تھی اور میجر کی شکل میں اسے وہ گھاٹ کا پتھر بھی مل گیا تھا۔

اس اونچے پہاڑ نے اپنے اندر سمیٹے ہوئے سارے خزانے اس گھاٹ کے پتھر کے حوالے کر دیئے جس نے اس ندی کو مزید بہنے سے روک دیا تھا اور اسے گلے لگا لیا تھا جسے سارے زمانے نے گلے لگانے سے انکار کر دیا تھا۔

اب میجر کی زندگی میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ اس نے اپنے خواب کے بیشتر حصوں میں رنگ بھر دیا۔ اور لمبی کاروں میں سفر کرنا، عالیشان ہوٹلوں میں موج اڑانا اس کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ اتنی ساری دولت کے ہجوم میں سماج میں بھی وہ مقام پانے میں کامیاب ہوجائے گا جسے عزت کہتے ہیں۔ مگر سماج کے لوگ بڑے سیانے تھے وہ گوبر اور حلوے میں تمیز کر سکتے تھے۔ انھوں نے اس رنگے سیار کو یہاں بھی پہچان لیا اور اپنی محفلوں میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔

اب میجر کی پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ نوکری چھوڑ کر لاکھوں کے کاروبار کا مالک بن گیا تھا مگر ایک پھانس اب بھی اس کے دل و دماغ میں چبھی ہوئی تھی، کہ کس طرح سماج میں عزت کا وہ مقام حاصل کیا جائے جو صاحب بہادر کا مقدر تھا۔

تھک ہار کر اس نے دوسری تدبیر نکالی۔ وہ اپنے کرتبوں سے لوگوں کو چونکا دینے میں ماہر تھا۔ اس لئے اس بار بھی وہ کامیابی کا متمنی تھا۔ اس نے اب ادبی مورچہ سنبھال لیا ــــ سوچا اب اس مورچے کے سہارے وہ عزت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔ اس نے اس مورچہ کی شروعات بڑے شاندار طریقے سے کی اور ایک ادبی رسالے کا اجراء کیا ــــ بہت سوچ سمجھ کر اس نے اس رسالے کا نام "بانگ" رکھا ــ اس کا ارادہ تھا کہ اس بانگ کی آواز اتنی پاٹ دار ہوگی کہ سارا زمانہ چونک پڑے گا اور اس کے گرد اکٹھا ہو جائے گا۔

جس طرح ایک رنڈی اپنی بیٹی کو شروع شروع میں خوب سجا سنوار کر قاتل اداؤں کے ساتھ گاہکوں کے سامنے پیش کرتی ہے تاکہ گاہک اس کی قاتل اداؤں کے شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے اس کی

زلف گرہ گیر کے اسیر ہو جائیں اور پھرنئی جوانی کے نام پر پرانا مال فروخت کیا جاتا رہے۔

ایسی ہی شروعات تھی "بانگ" کی اور ایسے ہی ارادے تھے میجر کے۔

پھر ایسا ہوا کہ سب "بانگ" کی آن بان میں کھو گئے اور میجر کا ماضی تھوڑی دیر کے لئے ان کے ذہنوں سے نکل گیا اور میجر کو سماج میں ایک باعزت مقام حاصل ہوگیا۔

اب میجر نے ہاتھ پاؤں نکالنا شروع کر دیا۔ اس نے سماج کے بلند ترین مقاموں پر قبضہ جمانے کی کوشش شروع کر دی۔ اور اپنی دولت سے من چاہی عزت خریدنے کا خواہش مند ہوگیا۔ مگر دولت سے آرام دہ بستر تو خریدا جاسکتا ہے نیند نہیں ــــ قیمتی کتابیں خریدی جاسکتی ہیں علم نہیں۔ عورت خریدی جاسکتی ہے مگر محبت نہیں ــــ

میجر کو کافی عرصے کی جدو جہد کے بعد اس حقیقت کا احساس ہوا اور اس کا ذہنی توازن بگڑنے لگا ساتھ ساتھ "بانگ" کا رنگ و روپ بھی۔ اب ادبی لوگ اس سے الگ ہونے لگے۔ "بانگ" کی جوانی کا جادو انہیں باندھے رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکا کیونکہ زن فاحشہ اور ادب کے خریدار میں کافی فرق ہوتا ہے۔

پھر اس نے پاگل کتے کی طرح لوگوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔ لوگ اس پاگل کتے سے بھاگنے لگے کہ کون جانے کب اسے کاٹ کھائے ــــ اب اسے احساس ہوا کہ سماج کا ایک طبقہ اس سے ڈرنے لگا ہے اور اس کے ایک جذبے کی تسکین ہونے لگی۔ مگر اسی سماج میں کچھ جیالے ایسے بھی تھے جو کتے کے کاٹے کا علاج جانتے تھے۔ وہ میجر کی عیاری و مکاری سے کب ڈرنے والے تھے ــــ میجر دانت نکالے دوڑا وہ نہیں بھاگے ــــ

اس نے انہیں جھنجھوڑ ڈالا وہ صرف مسکرا کر رہ گئے۔

اب میجر کے سارے ہتھیار کند ہو گئے تھے۔ اب وہ دن قریب آگیا جب وہ صرف اپنی ذات میں سمٹنا چاہتا تھا کیونکہ دوسری صورت تھی بھی نہیں۔

خود کو اپنی ذات کے حصار میں قید کرنے کے لئے اس نے اپنے عالیشان محل میں ایک آئینہ خانہ سجایا۔ ایک بڑا سا کمرہ رنگ برنگے جلووں سے بھر دیا گیا۔ کمرے کی دیوار کے چپے چپے میں آئینہ سجا دیا گیا۔ ایک آئینہ کا عکس دوسرے پر پڑتا پھر عکس در عکس کا سلسلہ اتنا طویل ہو جاتا کہ شمار ممکن نہیں رہتا۔

میجر نے جب اس آئینہ خانہ میں قدم رکھا تو ہر طرف اس کی ذات بکھر گئی۔ وہ جدھر بھی نظر اٹھا کر دیکھتا اسے دور دور تک اپنی ہی ذات کے مختلف گوشے نظر آتے۔ اس نے اپنی شخصیت کو الگ الگ زوایئے سے اس میں دیکھنا شروع کر دیا اور خوب مسرور ہونے لگا۔

اس کے تشنہ جذبوں کی تکمیل ہونے لگی اور وہ آئینہ خانہ میں اپنی ہی ذات کے حصار میں قید ہو کر رہ گیا۔۔۔ مگر اسے یہ پتہ ہی کب تھا کہ آئینے سچ بولتے ہیں۔

ایک بار وہ بہت خوش تھا۔ اس نے آج لوگوں کو جی بھر کے گالیاں دیں۔ ان کا مذاق اڑایا۔۔۔ ان کے اجداد کی مٹی پلید کی۔۔۔ پھر بھی اس کی سیرابی نہیں ہوئی تو وہ اپنے آئینہ خانے میں آیا۔۔۔

مگر آئینوں کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا۔۔۔

آج سارے آئینے سچ بول رہے تھے۔

اس کی زندگی کی ساری سچائی ان آئینوں نے ایک ساتھ اس پر ظاہر کر دی تھی۔

وہ جدھر بھی گھومتا، زندگی کا کوئی نہ کوئی سچ اس پر قہقہہ لگانے لگتا۔ اس کی زندگی کی ساری مکاری اور عیاری ایک ساتھ اس کے سامنے تھی جسے عرصہ ہوا وہ فراموش کر چکا تھا۔ ان آئینوں کو پتھروں سے بھی ڈر نہیں تھا کیونکہ وہ ہزاروں کرچیوں میں بکھر کر بھی صرف سچ بولتے تھے۔

ہر آئینہ اب اس کی ذات پر قہقہہ لگانے لگا۔ وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ وہ ان پر پتھر مارنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ انجام سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پتھر مارنے سے ان کی تعداد میں ہزار گنا اضافہ ہو جائے گا۔ پھر۔ پھر۔۔۔

اس پر بے بسی طاری ہونے لگی۔ اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے کپڑے تار تار کر دیئے۔ بالوں کو مٹھیوں سے نوچنے لگا ___ اپنا چہرہ اپنے ہی ناخنوں سے کھرچ ڈالا۔ مگر آئینوں نے قہقہہ لگانا اور سچ بولنا نہیں چھوڑا۔

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ وحشت بھری آنکھوں سے آئینوں کو گھورنے لگا اور سنبھل سنبھل کر قدم بڑھاتا ہوا آئینہ کے نزدیک گیا ___ اور اپنی عادت کے مطابق اس نے آئینہ پر تھوک دیا۔ تھوک کی کافی مقدار پچاک سے آئینہ پر پڑی اور پھیل کر کافی بڑی ہو گئی۔

اب اس تھوک کے اس دھبہ کا عکس ہر آئینہ پر ظاہر ہونے لگا۔

وہ جدھر بھی دیکھتا اپنے چہرے پر تھوک کی وافر مقدار پتی ہوئی پاتا۔

"قہقہہ۔۔۔ ___ قہہ ___ قہہ۔۔۔"

قہقہہ کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ سارے آئینے اس کی بے بسی پر قہقہہ لگا رہے تھے۔ اب اسے اپنی حیثیت اپنے ہی پھینکے گئے تھوک سے زیادہ نہیں لگ رہی تھی!!
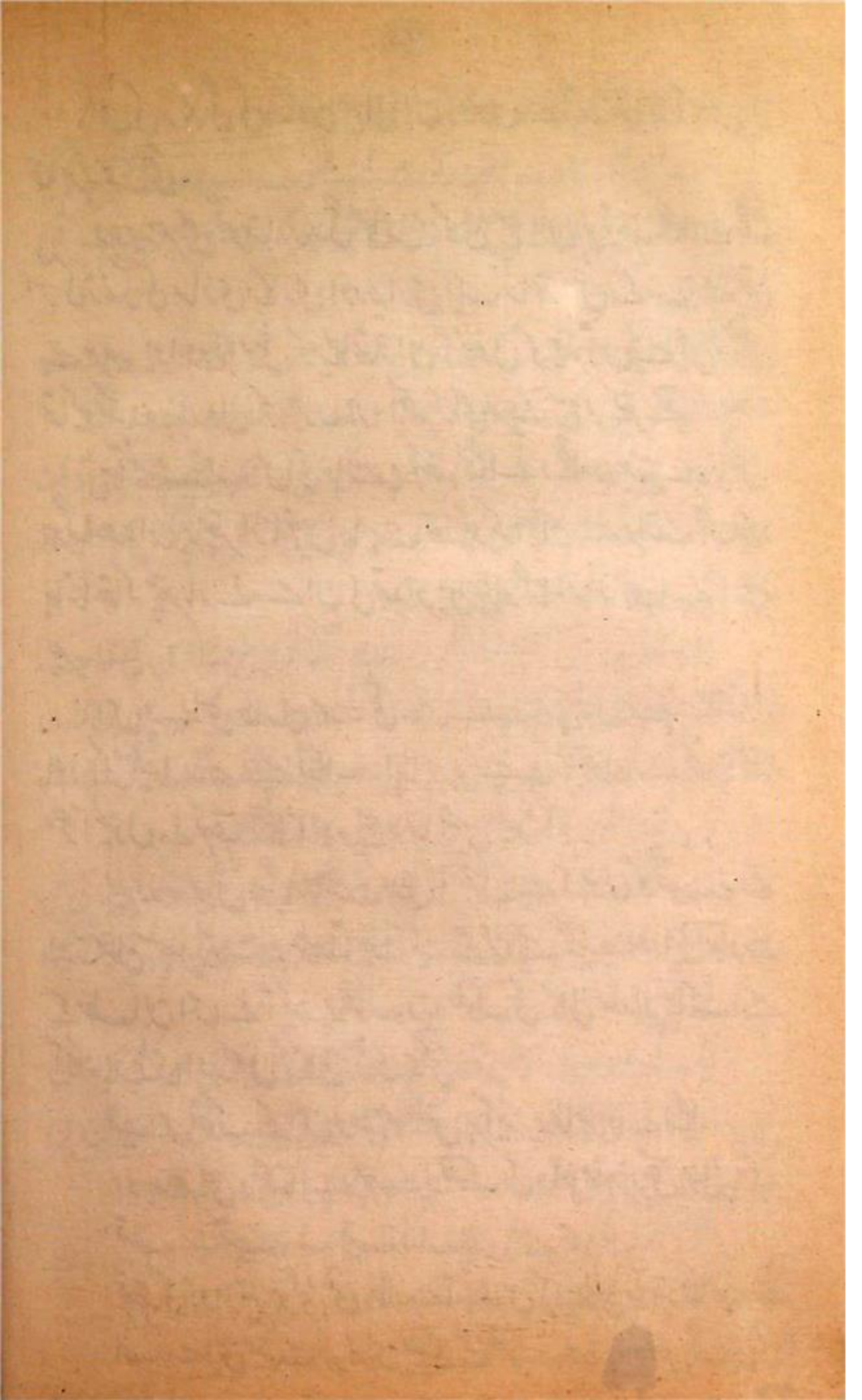
بند مٹھی کا نوحہ

آج مہینے کی پہلی تاریخ ہے۔ اسی پہلی تاریخ کے انتظار میں ہم لوگ انتیس دن جیسے تیسے گذار دیتے ہیں۔ ہر ماہ ایک ہی دن تو ہے ہمارے پاس خوش ہونے کے لئے۔ باقی انتیس دن تو دوسروں کے لئے ہوتے ہیں، جن میں مالک مکان، کرانہ اسٹور، بجلی والے، گوالے، دھوبی وغیرہ شمار کئے جاتے ہیں۔ ہمیں ان دنوں سے مطلب؟

یہ مارچ کی پہلی تاریخ ہے۔ اس لئے یہ میری خوشیوں کو دوبالا کرنے کا دن ہے۔ ہر سال اس دن میری خوشیوں کی انتہا نہیں رہتی۔ برسوں سے اس دن کو بہار کا پہلا جھونکا سمجھ کر زندگی کا سارا دکھ سارا غم پروین کی زلفوں کی چھاؤں میں بھلا دیتا ہوں۔ آج ہی کے دن میری بنجر سی زندگی

میں پروین محبت کا بیج لے کر داخل ہوئی تھی۔ اور تب سے آج تک دکھ کا ہر لمحہ وہ اپنی مسکراہٹ میں جذب کرتی جا رہی ہے۔ اپنی شادی کی سالگرہ ہم بالکل اپنے ڈھنگ سے مناتے ہیں۔ دوسروں کی طرح ہم کلبوں یا پارٹیوں میں نہیں گذارتے۔ ہم سینما دیکھ کر بھی اسے ضائع نہیں کرتے۔ ہوٹل میں جا کر منہ کا ذائقہ بھی تبدیل نہیں کرتے۔ ہم تو یہ شام کمرے میں بند ہو کر گذارتے ہیں۔ یارو کی زلفوں کی چھاؤں میں منہ چھپا کر میں سب کچھ بھول کر بہت کچھ یاد کرتا ہوں۔ اس کی پیاری پیاری باتوں میں کھو کر ایک ایک لمحے کو زندگی عطا کرتا ہوں۔ باہر تو وہ لوگ بھاگتے ہیں جنھیں گھر میں چین نہیں۔ بچوں کی فوج میں سکون بھر لمحہ میسر نہیں۔ مگر ہم تو اس جھمیلے سے پاک ہیں۔ صرف گڈو ہمارے ساتھ ہے دو سال کا پیارا پھول، ہمارے گلشن حیات کی امانت ہے۔ ہماری بھی خواہش ہوتی ہے کہ دیگر والدین کی طرح ہم بھی اپنے جگر گوشہ کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائیں۔ گڈو کے وزن کا لذیذ کیک بنوا کر محلے کے سارے بچوں کے درمیان تقسیم کریں۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، کی آواز سننے کے لئے ہمارے کان ترس گئے ہیں مگر ہم کیا کریں ہم تو مجبور محض ہیں قصور اس میں ہمارا نہیں بلکہ گڈو کا ہے، جو مہینے کی ستائیس تاریخ کو پیدا ہوا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی تاریخ ہے پیدا ہونے کی؟ اگر کسی بابو کے گھر پیدا ہونا ضروری ہی تھا تو پھر کسی مہینے کی پہلی تاریخ کو ہوا ہوتا۔ ایک چار سو روپے پانے والے بابو ستائیس تاریخ کو اپنے بچے کی سالگرہ کیوں کر منا سکتا ہے؟ وہ تو میری قسمت ساتھ دے گئی کہ شادی پہلی تاریخ کو ہوئی جس دن مہینے بھر کی کمائی مٹھی میں بند ہوتی ہے۔ کم از کم اس کی گرمی سے دل کے برفیلے جذبات پگھل تو سکتے ہیں۔ اگر میری

شادی بھی ستائیس تاریخ کو ہوئی ہوتی تو.... تو.... اس کے آگے میں سوچ بھی نہیں سکتا، کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں پرواز کے پر جلنے لگتے ہیں۔ اور پھر خواہ مخواہ یہ سب سوچ کر میں اس حسین شام کو برباد کیوں کروں؟

میں روپے کی گرمی محسوس کرتے ہوئے مٹھائی کے ڈبے کو تھامے تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر کی جانب بھاگا جا رہا ہوں۔ ذہن میں بس پارو ہی پارو ہے۔ جو آج بھی چوتھی کی سرخ ساڑی پہنے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کرنیں سجائے آنکھوں میں انتظار کی شمعیں جلائے دروازے پر کھڑی ٹکٹکی باندھے سڑک کی جانب تک رہی ہوگی۔

میں تصور کی دنیا میں گم آنے والے لمحوں کی لذت سے سرشار بھاگا جا رہا ہوں۔ بس ایک ہی فرلانگ رہ گیا ہے۔ پھر میں ہوں گا اور وہ لمحے جو ہمارے درمیان ہوں گے۔

چلڈرن پارک کے موڑ پر جیسے ہی مڑا، گل مہر کے سائے تلے ایک لڑکی بڑی بے تابی سے کوئی شئے تلاش کرتی ہوئی نظر آئی۔ قدموں کی آہٹ پاکر وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگی۔ لڑکی سے آنکھیں ملتے ہی میں نے اس کی آنکھوں میں پھیلی بے بسی، بے چینی اور خوف کی لہر کو اچھی طرح پہچان لیا۔ میرے قدم آپ سے آپ رک گئے۔ مگر کوئی اور دن ہوتا تو میں ادھر دھیان دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ مگر آج میرے دل میں زمانے بھر کی محبت ہے ہمدردی ہے اس میں نفرت یا بے تعلقی نام کو بھی نہیں ـــــ

"کہیں کوئی مصیبت نہ آپڑی ہو اس پر ـــ؟" یہی سوچ کر میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تلاش رہی ہو یہاں — ؟"

"جی۔۔جی۔۔ وہ ۔۔۔" وہ کچھ بول نہ سکی۔

شام کی ساری سیاہی اس کے چہرے سے چپک گئی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ ایک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی جو اپنی جوانی کے سبک بوجھ کو سنبھالنے میں بھی ناکام ہو رہی تھی۔ ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے بھولے پن نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

" ہاں، ہاں کہو، کیا بات ہے ؟"

"جی، وہ دس روپے کا نوٹ تلاش رہی ہوں جس سے بابو کے لئے دارو خریدنا تھا۔ جو نہ جانے کس طرح دوپٹے سے کھل کر گیا۔ اب اگر دارو کے بغیر جاؤں گی تو ۔۔۔ تو۔۔۔۔"

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی اور کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ باقی باتیں میں خود سمجھ گیا تھا اور پڑوس کا جمن میری نگاہوں میں پھر گیا جو دارو پی کر اپنی بیوی بیٹی کو بے تحاشہ پیٹا کرتا ہے۔ تصور میں ہی میں نے اس نازک لڑکی کی پیٹھ پر شڑاپ شڑاپ کی آواز سنی اور اس دردناک منظر سے کانپ گیا۔

جلدی سے میں نے یار و کے صدقے میں دس روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو رکھ لو — اب تو تمہارا باپ تمہیں نہیں پیٹے گا۔

اس نے جھٹ سے روپیہ اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔ اس کے چہرے پر پھیلنے والے سکون اور طمانیت کو میں دیکھ بھی نہ سکا کیونکہ مجھے گھر پہنچنے کی

جلدی تھی۔ پارو کتنی شدت سے میری منتظر ہو گی۔ وہ شاید پلک جھپکانا بھی بھول گئی ہو گی ــــ پارو ــــ میری اچھی پارو ــــ میری زندگی۔

میں آنے والے لمحوں کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے تیزی سے گھر کی طرف بھاگا جا رہا ہوں۔ اچانک محسوس ہوا کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے میں نے جھٹ مڑ کر دیکھا۔ ارے یہ تو وہی لڑکی ہے، جسے میں نے ابھی ابھی دس روپے کا نوٹ دیا تھا۔

"اب کیا ہے بھئی ــ؟"

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا ہی تھا کہ وہ سر جھکائے ہوئے بہت دھیمے لہجہ میں بولی۔

"کہاں چلنا ہے بابو ــــ گھر یا کسی ہوٹل؟"

●●

مشتاق احمد نوری کا پہلا افسانوی مجموعہ

تلاش — ۱۹۸۷ء